ماہنامہ

ضیائے حدیث

لاہور

علمی | ادبی | تحقیقی | اصلاحی مجلّہ

دارالسلام
DARUSSALAM
دارالسلام کی تحقیق کا آئینہ دار

چیف ایڈیٹر
عبدالمالک مجاہد

جلد:22 | شمارہ:04 | اپریل 2013ء/جمادی الثانیہ 1434ھ





علم کی ناقدری نے ہمیں بے وقار قوم بنا دیا

ڈاکٹر تحسین فراقی (ڈائریکٹر مجلس ترقی اردو ادب) کا انٹرویو

کتاب بہترین ہم نشین

23 اپریل ''عالمی یومِ کتاب'' کے سلسلے میں دلچسپ کاوش

مشرقِ وسطیٰ

خطے کی حالیہ صورتِ حال کا جائزہ

قصہ اسلامی ناموں کے بگڑنے کا

میڈیا پر غلط استعمال ہونے والے
اسلامی ناموں کی نشاندہی

مروجہ جہیز کی شرعی حیثیت

ایک اہم مسئلے کا
متوازن حل

بدعنوانی اور احتساب

Corruption & Accountability

تاریخی واقعات اور بہترین شرعی راہ نمائیاں

ماہنامہ

علمی | ادبی | تحقیقی | اصلاحی مجلہ

ضیائے حدیث

لاہور

جلد:22 | شمارہ:04 | اپریل 2013ء / جمادی الثانیہ 1434ھ

چیف ایڈیٹر

عبدالمالک مجاہد • بیاد مولانا عبدالمجید سوہدروی • بانی مولانا محمد ادریس فاروقی

وسعتِ دامان

احکام و مسائل — نام سے متعلق احکام — حافظ شبیر صدیق — 35



مکتوب الریاض — ظلم سے بچو — عبدالمالک مجاہد — 58



فکرِ آخرت — یادیں — ڈاکٹر بشریٰ تسنیم (شارجہ) — 62



تعلیم و تربیت — طالب علم اور موبائل فون کا منفی استعمال — عبدالوارث ساجد — 70



انوار حدیث — الاربعین فی فضائل الحسنین رضی اللہ عنہما — فضل اکبر کاشمیری — 8

سیاسیات — بدعنوانی اور احتساب — حافظ محمد حق نواز — 11

اصلاحِ معاشرہ — مروجہ جہیز کی شرعی حیثیت؟ — حافظ صلاح الدین یوسف — 17

تزکیہ نفس — رزقِ حلال ہی کیوں.....؟ — الشیخ عبداللہ ناصر رحمانی — 21

عالمی منظر نامہ — مشرقِ وسطیٰ کی حالیہ صورت حال — محمد انیس الرحمٰن — 27

پکار — کتاب بہترین ہم نشین — محمد نعمان فاروقی — 31

احکام و مسائل — نام سے متعلق احکام — حافظ شبیر صدیق — 35

انٹرویو — علم کی ناقدری — محمد ارسلان حجازی — 40

عالم اسلام — عراق کے تاریخی شہر — محسن فارانی — 48

اشاعت حدیث — غیر معروف مگر صحیح یا حسن احادیث — ابوانس — 54

تحقیق و تنقید — قصہ اسلامی ناموں کے حلیہ بگڑنے کا — محسن فارانی — 55

اصلاحِ معاشرہ — جعل سازی اور دھوکا دہی سے بچ جائیں — مولانا لیاقت علی باجوہ — 57

مکتوب الریاض — ظلم سے بچو — عبدالمالک مجاہد — 58

فکرِ آخرت — یادیں — ڈاکٹر بشریٰ تسنیم (شارجہ) — 62

معاشیات — پیشۂ تجارت — حافظ عبدالسمیع — 63

مکتوب امریکہ — حق پہچان کر تسلیم نہ کرنا — حافظ عبدالوحید سوہدروی — 66

تعلیم و تربیت — طالب علم اور موبائل فون کا منفی استعمال — عبدالوارث ساجد — 70

ادب و انشا — لباس بھی گفتگو کرتا ہے — عمران سارم — 73

تبصرۂ کتب — کتابوں کے دیس میں — ایڈیٹر — 75

چیف ایڈیٹر حافظ عبدالوحید سوہدروی — ایڈیٹر محمد نعمان فاروقی

numanfaruqi@gmail.com

مجلس ادارت

مولانا ارشاد الحق اثری — پروفیسر محمد یحییٰ — حافظ عبدالستار حماد

حافظ صلاح الدین یوسف — حافظ شبیر صدیق — حافظ محمد حق نواز

مجلس مشاورت

چوہدری محمد یٰسین ظفر — ڈاکٹر محمد حماد لکھوی — مولانا محمد عبدالجبار

عکاشہ مجاہد

مجلس نظامت

حافظ عبدالعظیم اسد — قمر الحمید فیصل — عبدالغفار مجاہد

شیخ ارشد علی — محمد اعظم یٰسین — حافظ محمد ندیم

آرٹ اینڈ ڈیزائن — طارق جاوید عارفی — حافظ عثمان یوسف

محمد صفت الٰہی (آرٹ ڈائریکٹر) ہارون الرشید (گرافک ڈیزائنر) قانونی مشیر

خطاطی اکرام الحق کمپوزنگ محمد وسیم کیلانی ملک نور محمد سرفراز

ضیائے حدیث جاری کروانے کے لیے

منی آرڈر، آن لائن یا ایزی پیسہ کے ذریعے سالانہ زرتعاون دفتر ارسال کریں اور حسب ذیل نمبرز میں سے کسی ایک پر اطلاع دیں اور اپنا مکمل ایڈریس لکھوائیں۔ رسالہ آپ کے نام جاری ہو جائے گا۔

- منی آرڈر اور خط کتابت کے لیے:

دفتر ماہنامہ ''ضیائے حدیث'' 36 لوئر مال، لاہور (پاکستان)

- آن لائن کروانے کے لیے:

A/C Title: Monthly Zia-e-hadith
A/C No: 0038805201002063
M.C.B Bank Ltd. Session Court Branch
Lahore. Br Code: 1317

- برائے ایزی پیسہ: موسیٰ علی: 0313 75 79 034
شناختی نمبر: 34101-4002586-9

سرکولیشن منیجر: محمد یوسف سلفی +92 300 70 71 823

شعبہ ترسیل: موسیٰ کلیم بلتستانی +92 313 75 79 034

Tel:+92 42 372 32 400 | Fax:+92 42 373 54 072

ziaehadith1@yahoo.com

ناشر محمد ادریس فاروقی مقام اشاعت 399/E اندرون موچی دروازہ، لاہور

پرنٹر انٹرنیشنل دارالسلام پرنٹنگ پریس، 36۔لوئر مال، لاہور

دیگر ممالک میں سالانہ زرتعاون

سعودی عرب 100 ریال
یورپی ممالک 30 یورو

قیمت فی شمارہ 35 روپے | سالانہ زرتعاون: عام ڈاک صرف -/400 روپے، رجسٹری ڈاک -/800 روپے

دعوت اور حکمت ساتھ ساتھ

مارچ 2013ء کی ایک شام ریاض میں ہم شیخ عبدالرحمٰن آل الشیخ کے گھر جمع تھے۔ وہاں مختلف قومیتوں کے لوگوں سے دعوت الی اللہ کے حوالے سے گفتگو ہونی تھی۔ وہاں ہماری ملاقات ڈاکٹر یٰسین صاحب سے بھی ہوئی۔ ڈاکٹر یٰسین کوئی تین ہفتے پہلے ہی دارالسلام تشریف لائے تھے۔ وہ البصر فاؤنڈیشن کے کوآرڈی نیٹر ہیں۔ یہ فلاحی تنظیم دنیا بھر میں آنکھوں کا مفت علاج کرتی ہے۔ آج سے بیس سال قبل قائم ہونے والی یہ فلاحی تنظیم سعودی عرب میں لانچ ہوئی۔ غریب ممالک میں آنکھوں کا مفت آپریشن کرنے والی یہ تنظیم اب تک بائیس لاکھ سے زائد آپریشن کر چکی ہے۔ 22 ڈاکٹروں پر مشتمل ٹیم مختلف ممالک میں آنکھوں کے علاج کے لیے مفت کیمپ لگاتی ہے۔ پاکستان میں بھی جامعہ اثریہ جہلم میں اس تنظیم کے زیر اہتمام ہر سال کیمپ لگایا جاتا ہے۔ چند دن میں سینکڑوں لوگوں کا آپریشن ہوتا ہے۔ اسری میڈیکل کالج کے تاسیسی ممبر ڈاکٹر چنا صاحب سے اس تنظیم کی کارکردگی کے بارے میں معلومات ملتی رہیں، مگر ڈاکٹر یٰسین نے جو ہمیں معلومات دیں، وہ بڑی چشم کشا تھیں۔

ڈاکٹر یٰسین صاحب کا تعلق سعودی عرب سے ہے۔ بہت سارے ممالک میں فری کیمپ لگا چکے ہیں۔ ان دنوں وہ افریقی ممالک میں ''البصر فاؤنڈیشن'' کے انچارج ہیں۔ دورانِ مجلس ہماری گفتگو کا رخ اصل موضوع، یعنی دعوت الی اللہ کے لیے عمدہ اسلوب اپنانے کی طرف ہوا۔ اس موقع پر انھوں نے جو واقعہ سنایا، وہ سنانے کے لیے میں نے اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھی ہے۔ یہ واقعہ دعوت کا کام کرنے والوں کے لیے رہنما اصول ہے۔

حبشہ کا نام آج کے دور میں ایتھوپیا ہے۔ دنیا کے غریب ترین ملکوں میں شمار ہونے والا یہ ملک بدامنی، فقر و فاقہ اور مذہبی تعصب کے حوالے سے خاصا معروف ہے۔ یہاں عیسائیوں کی حکومت ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ بڑا معاندانہ ہے۔ ڈاکٹر یٰسین کہہ رہے تھے کہ ہم ایک مدت سے اس ملک میں کیمپ لگانے کا پروگرام بنا رہے تھے مگر اس کے لیے سرکاری مشینری ہمارے ساتھ تعاون نہیں کر رہی تھی۔ اس لیے ہم خاصی کوششوں کے بعد بھی اس ملک میں کیمپ نہ لگا سکے۔ ہم نے ایک مڈل مین تلاش کیا۔ اس کی وساطت سے کسی طرح ایتھوپیا کے صدر سے ملاقات کا وقت لینے میں کامیاب ہوگئے۔ ہماری توقع کے برعکس ان کی کابینہ کے ارکان، ان کے خصوصی معاون، مشیر وغیرہ بھی اس ملاقات میں موجود تھے۔ سرکاری میڈیا اپنے لاؤ لشکر سمیت موجود تھا۔ حبشہ (موجودہ ایتھوپیا) کے صدر جرما ویلڈی جیورجس بڑے کروفر سے تشریف لائے۔ انھیں ہمارے بارے میں بڑا غلط گائیڈ کیا گیا تھا کہ ہم متشدد ہیں، وہابی ہیں، ان کے ملک میں مسائل پیدا کرنے کے لیے آئے ہیں۔ گفتگو کا آغاز ہوا تو ان کا لہجہ بڑا سخت تھا۔ بڑے کھردرے لہجے میں پوچھنے لگے کہ اچھا! تم لوگوں کو وہابی بنانے کے لیے آئے ہو!! تم اسلام پھیلانا چاہتے ہو!!

جب ہم ان کی جلی کٹی باتیں سن چکے تو پھر میری باری تھی۔ ''جناب صدر!'' میں گویا ہوا ''ہم تو آپ کے ملک میں ایک قرض کی ادائیگی کے لیے آئے ہیں۔ ہمارے ذمے ایک قرض ہے جسے ادا کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم تو محترم صدر صاحب! آپ کے ملک میں اس قرض کو چکانے آئے ہیں۔ صدر صاحب نے اپنے شانے اچکائے اور قدرے بدلی ہوئی آواز میں کہنے لگے کہ ہم نے تو کبھی کسی کو قرض نہیں دیا۔ ہمارے پاس دینے کے لیے ہے بھی کیا؟ میں نے اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا: مگر جناب صدر، یہ بڑی پرانی بات ہے۔ اس قرض کو کئی صدیاں گزر چکی ہیں۔ میرے ملک کے لوگوں پر نہایت مشکل وقت آیا تھا۔ جس بنا پر میرے آباء و اجداد مکہ مکرمہ سے آپ کے ملک کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ آپ کے آباء و اجداد میں سے ایک بادشاہ تھا جس کا نام نجاشی تھا۔ اس نے بڑے کھلے بازوؤں سے ہمارے آباء و اجداد کا استقبال کیا تھا۔ ان

لوگوں کو پناہ دی تھی۔ انھیں باعزت طور پر اپنے ملک میں رہنے کی اجازت دی تھی۔

جناب صدر! آپ کے ملک کے بادشاہ اور اس کے عوام کا ہمارے اوپر صدیوں سے یہ قرض چلا آرہا ہے۔ اس وقت آپ کے ملک کے عوام بے حد غریب ہیں۔ یہاں علاج معالجہ کی سہولتوں کا فقدان ہے۔ ہمارے کچھ ساتھیوں نے مل کر ''البصر'' کے نام سے ایک خیراتی اور فلاحی تنظیم بنائی ہے جو آنکھوں کا مفت آپریشن کرتی ہے۔ لوگوں کو مفت دوائیاں حتی کہ مفت عینکیں تک مہیا کرتی ہے۔

ڈاکٹر یٰسین حبشہ کے صدر کے سامنے نہایت موثر تقریر کر رہے تھے۔ انھوں نے ان کو چودہ سو سال قبل نجاشی کے دربار میں سیدنا جعفر طیار رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی سرگزشت بیان کی۔ ان کو بتایا کہ وہ کس طرح ہجرت کر کے آپ کے ملک میں آئے تھے اور آپ کے بادشاہ کا کیا رویہ تھا۔ صدر صاحب گفتگو بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ ایوان میں سناٹا طاری تھا۔ تمام وزراء اور حکام بڑے متاثر نظر آرہے تھے۔ میں نے جو گفتگو کی وہ ان کی سمجھ میں آچکی تھی۔ صدر صاحب نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگے: ڈاکٹر یٰسین! تمھاری ڈیمانڈ کیا ہے؟ تم کیا چاہتے ہو؟ میں نے ان سے عرض کی کہ جناب صدر! ہمارے صرف دو مطالبات ہیں: ایک تو ہم ''البصر'' کو آپ کے ملک میں رجسٹرڈ کروانا چاہتے ہیں کہ ''البصر'' کو اس ملک میں فری کیمپ لگانے کی اجازت دی جائے۔ دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ ہم اس ملک میں مختلف شہروں میں تین ہسپتال بنانا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کے لیے زمین حکومت مہیا کرے۔ آپ ہمیں مفت زمین دیں، ہم ہسپتال بنائیں گے تاکہ لوگوں اور آئندہ آنے والی حکومتوں کے علم میں ہو کہ یہ ہسپتال حکومت کے ایماء، اس کی منظوری اور اس کے تعاون سے بنے ہیں اور مستقبل میں بھی کسی کو انھیں بند کرنے کی جرأت نہ ہو۔ ڈاکٹر یٰسین صاحب کی مؤثر گفتگو کا جادو چل چکا تھا۔

صدر صاحب نے اپنے وزراء کی طرف دیکھا، اپنے خصوصی مشیر کو اشارہ کر کے اپنے پاس بلوایا۔ کچھ کھسر پھسر کی اور بلند آواز سے کہنے لگے کہ وفد کے دونوں مطالبات کو فوری طور پر منظور کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے پہلے ''البصر'' کو رجسٹرڈ کیا جائے۔ ان کی خواہش کے مطابق تینوں شہروں میں ان کو زمین کے بڑے بڑے قطعات مفت دیے جائیں۔

ڈاکٹر یٰسین کی مؤثر گفتگو کا نتیجہ فوری طور پر سامنے آگیا۔ وہ کام جس کے لیے پہلے خاصی مدت سے جدوجہد ہو رہی تھی، جو بڑا مشکل اور ناممکن کام لگتا تھا، اللہ کے فضل وکرم، دعاؤں کی برکتوں اور اعلیٰ اسلوب کی وجہ سے وہ کام ہو گیا۔

قارئین کرام! میں نے اپنی زندگی میں متعدد بار آزمایا ہے کہ محض اچھے الفاظ کے چناؤ اور اچھے انداز کی وجہ سے آپ ناممکن کاموں کو بھی ممکن بنا سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بڑی قد آور شخصیت سے میں نے ایک کام منوانا تھا۔ بظاہر لگتا تھا کہ وہ یہ بات تسلیم نہیں کریں گے مگر میں نے اسلوب ہی ایسا اختیار کیا کہ انھوں نے فوراً میری بات مان لی۔ میں نے ان سے کہا کہ جناب محترم..... یقیناً آپ کی نیکیاں بہت زیادہ ہیں، اللہ ان میں مزید اضافہ فرمائے۔ کیا آپ نہیں چاہیں گے کہ ان نیکیوں میں مزید اضافہ ہو؟ یقیناً ان کا جواب تھا کہ کیوں نہیں، ضرور چاہوں گا کہ ان نیکیوں میں اضافہ ہو جو آخرت میں میرے کام آئیں۔ ''تو پھر..... یہ یہ کام کرنا چاہیے۔'' میں نے نہایت ہی ادب سے عرض کی اور پھر ان سے اسی مجلس میں اپنی بات منوالی۔

قارئین کرام! آپ بھی میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ دعوت الی اللہ کے لیے ہمیں بہترین اسلوب اور بہترین انداز اختیار کرنا چاہیے۔

قرآن کریم نے اس بارے میں بڑی وضاحت سے رہنمائی فرمائی ہے: ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ ''لوگوں کو اپنے رب کی طرف دعوت دو، حکمت اور اچھے وعظ کے ساتھ۔'' (النحل 125:16) یاد رکھیے کہ آپ اچھے انداز میں گفتگو کر کے لوگوں سے جو بات منوا سکتے ہیں، وہ جارحانہ انداز سے بڑی مشکل سے مانی جائے گی۔

محبکم: عبدالمالک مجاہد



الاربعین فی فضائل الحسنین

سیدنا حسن اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہما کے فضائل سے متعلق چالیس صحیح احادیث وآثار

فضل اکبر کاشمیری

①رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حسن اور حسین رضی اللہ عنہما اہل جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔'' (جامع الترمذي:3777، عن ابی سعید رضی اللہ عنہ)

②سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ان دونوں (حسن وحسین رضی اللہ عنہما) سے محبت کی تو یقیناً اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان دونوں سے بغض کیا تو یقیناً اس نے مجھ سے بغض کیا۔(مسند احمد:440/2)

③نبی ﷺ نے فرمایا: ''یہ دونوں (حسن و حسین رضی اللہ عنہما) دنیا میں میرے دو پھول ہیں۔'' (صحیح البخاري:3753، عن ابن عمر رضی اللہ عنہ)

④جب یہ آیت ﴿نَدْعُ اَبْنَآءَ نَا وَاَبْنَاءَ كُمْ﴾ (اٰل عمرٰن 3: 61) نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور فرمایا: ''اے اللہ! یہ میرے اہل (بیت) ہیں۔'' (صحیح مسلم: (32)-2404، عن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ)

⑤سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک دن صبح کو نبی ﷺ تشریف لائے اور آپ کے جسم مبارک پر اونٹ کے کجاوے جیسی دھاریوں والی ایک اونی چادر تھی۔ اسی دوران حسن بن علی رضی اللہ عنہما تشریف لائے، آپ ﷺ نے انھیں چادر میں داخل کرلیا، پھر حسین رضی اللہ عنہ تشریف لائے، وہ چادر کے اندر داخل ہوگئے، پھر فاطمہ رضی اللہ عنہا تشریف لائیں تو انھیں آپ ﷺ نے چادر کے اندر داخل کرلیا، پھر علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو انھیں بھی آپ ﷺ نے چادر کے اندر داخل کرلیا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے اہل بیت! اللہ صرف یہ چاہتا ہے کہ تم سے پلیدی دور کردے اور تمھیں خوب پاک صاف کردے۔'' (صحیح مسلم:2424)

⑥سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ کی بیویاں آپ کے اہل بیت میں سے ہیں لیکن اہل بیت سے مراد وہ ہیں جن پر آپ کے بعد صدقہ حرام ہے۔(صحیح مسلم: 2408)

⑦رسول اللہ ﷺ نے اپنی دائیں طرف فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اور بائیں طرف علی رضی اللہ عنہ کو بٹھایا اور اپنے سامنے حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو بٹھا کر فرمایا: ''اے اہل بیت! اللہ صرف یہ چاہتا ہے کہ تم سے پلیدی دور کردے اور تمھیں خوب پاک وصاف کردے۔ اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں۔'' (مسند احمد:107/4، عن واثلة رضی اللہ عنہ)

⑧سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرمایا: ''اے میرے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں۔'' (المستدرك للحاكم : 416/2)

⑨علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کے اہل بیت میں ہونے کے بیان والی ایک حدیث عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ (جامع الترمذی:3787)

⑩حدیث نمبر: 8 کے شاہد کے لیے دیکھیے: (مسند احمد: 292/6) اس میں صحیح سند سے اس کی تائیدی روایت موجود ہے۔

⑪نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس فرشتے نے مجھے خوش خبری دی کے بے شک حسن وحسین اہل جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔'' (سنن ابن ماجه: 118، عن حذيفة رضی اللہ عنہ)

⑫عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''حسن اور حسین اہل جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں اور ان کا باپ ان دونوں سے بہتر ہے۔'' (المستدرك للحاكم:167/3)

⑬سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''یہ دونوں میرے بیٹے اور نواسے ہیں، اے میرے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان دونوں سے محبت کر اور جو اِن سے محبت کرے تو اس سے محبت کر۔'' (جامع الترمذي: 3769)

⑭ عطاء بن یسار بیان کرتے ہیں کہ انھیں ایک صحابی نے بتایا، انھوں نے دیکھا کہ نبی ﷺ حسن اور حسین کو سینے سے لگا کر فرما رہے تھے: ''اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو (بھی) ان دونوں سے محبت کر۔'' (مسند احمد: 369/5)

⑮ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تمھیں جو نعمتیں کھلاتا ہے ان کی وجہ سے اللہ سے محبت کرو، اور اللہ کی محبت کی وجہ سے مجھ سے محبت کرو، اور میری محبت کی وجہ سے میرے اہل بیت سے محبت کرو۔'' (جامع الترمذي: 3798)

⑯ ایک دفعہ نبی ﷺ خطبہ دے رہے تھے کہ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما تشریف لے آئے تو آپ ﷺ منبر سے اترے اور انھیں پکڑ کر اپنے سامنے لے آئے، پھر آپ نے خطبہ شروع کر دیا۔ (جامع الترمذي: 3783)

⑰ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! ہم اہل بیت سے جو آدمی بھی بغض رکھے گا تو اللہ تعالیٰ ضرور اسے آگ میں داخل کرے گا۔'' (صحيح ابن حبان: 408/21، وسير اعلام النبلاء: 123/2)

⑱ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ منبر پر خطبہ دے رہے تھے۔ آپ کے پہلو میں حسن بن علی رضی اللہ عنہما تھے، آپ کبھی لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور کبھی ان کی طرف اور فرماتے: ''میرا یہ بیٹا سردار ہے اور شاید اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں میں صلح کرائے گا۔'' (صحيح البخاري: 2704)

⑲ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ حسن رضی اللہ عنہ آپ کے کندھے پر تھے اور آپ یہ فرما رہے تھے کہ اے اللہ! مجھے اس سے محبت ہے تو بھی اس سے محبت کر۔ (صحيح البخاري: 3749)

⑳ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دن کے ایک حصہ میں تشریف لے چلے، نہ آپ نے مجھ سے کوئی بات کی اور نہ میں نے آپ سے۔ اسی طرح آپ بنی قینقاع کے بازار میں آئے، پھر فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر کے آنگن میں بیٹھ گئے اور فرمایا: وہ بچہ کہاں ہے؟ وہ بچہ کہاں ہے؟ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکیں۔ میں نے خیال کیا، ممکن ہے حسن رضی اللہ عنہ کو کرتہ وغیرہ پہنا رہی ہوں یا نہلا رہی ہوں۔ تھوڑی ہی دیر بعد حسن رضی اللہ عنہ دوڑتے ہوئے آئے، آپ ﷺ نے ان کو سینے سے لگا لیا اور بوسہ لیا، پھر فرمایا: ''اے اللہ! اسے محبوب رکھ اور اس شخص کو بھی محبوب رکھ جو اس سے محبت رکھے۔'' (صحيح البخاري: 2122)

㉑ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے زیادہ اور کوئی شخص نبی ﷺ سے زیادہ مشابہ نہیں تھا۔ (صحيح البخاري: 3752)

㉒ سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی ﷺ انھیں اور حسن رضی اللہ عنہ کو پکڑتے اور فرماتے: ''اے اللہ! تو انھیں اپنا محبوب بنا کہ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔'' (صحيح البخاري: 3735)

㉓ سیدنا عتبہ بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ حسن رضی اللہ عنہ کو اٹھائے ہوئے ہیں اور فرما رہے ہیں: میرے باپ ان پر فدا ہوں۔ یہ نبی ﷺ سے مشابہ ہیں۔ (صحيح البخاري: 3750)

㉔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نبی کریم ﷺ کی خوشنودی آپ کے اہل بیت کے ساتھ محبت و خدمت کے ذریعے سے تلاش کرو۔ (صحيح البخاري: 3751)

㉕ سیدنا مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حسن رضی اللہ عنہ کو گود میں بٹھایا اور فرمایا: ''یہ مجھ سے ہے۔'' (سنن أبي داود: 4131)

㉖ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔ اللہ اس سے محبت کرے جو حسین سے محبت کرتا ہے، حسین میری نسلوں میں سے ایک نسل ہے۔'' (جامع الترمذي: 3774، عن يعلى بن مرة رضي الله عنه)

㉗ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن میں نبی ﷺ کے پاس گیا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے پوچھا: اے اللہ کے نبی! کیا کسی نے آپ کو ناراض کر دیا ہے؟ آپ کی آنکھوں سے آنسو کیوں بہہ رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے پاس سے ابھی جبریل اٹھ کر گئے ہیں، انھوں نے مجھے بتایا کہ حسین کو فرات کے کنارے قتل کیا جائے گا۔'' (مسند احمد: 85/1)

㉘ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے

کہ میں نے ایک دن دوپہر کو خواب میں دیکھا، آپ ﷺ کے بال بکھرے ہوئے اورگرد آلود تھے، آپ کے ہاتھ میں خون کی ایک بوتل تھی۔ میں نے پوچھا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، یہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ حسین اوران کے ساتھیوں کا خون ہے، میں اسے صبح سے اکٹھا کر رہا ہوں۔''

(مسند احمد: 242/1)

㉙ سیدہ ام سلمہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حسین بن علی رضی اللہ عنہما موجود تھے اور آپ رو رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے جبریل نے بتایا کہ میری امت اسے میرے بعد قتل کرے گی۔'' (المستدرك للحاكم: 476/7).

㉚ شہر بن حوشب سے روایت ہے کہ جب حسین بن علی کی شہادت کی خبر عراق سے آئی تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''عراقیوں پر لعنت ہو، عراقیوں نے آپ کو قتل کیا ہے، اللہ انھیں قتل کرے، انھوں نے آپ کو دھوکا دیا اور آپ کو ذلیل کیا، اللہ انھیں ذلیل کرے۔'' (مسند احمد: 298/6)

㉛ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے مچھر مارنے کے متعلق پوچھا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے دریافت فرمایا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اس نے بتایا کہ عراق کا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس شخص کو دیکھو مچھر کے بارے میں پوچھ رہا ہے، حالانکہ اس کے ملک والوں نے رسول اللہ ﷺ کے نواسے کو قتل کر ڈالا، میں نے آپ سے سنا، آپ فرما رہے تھے: ''یہ دونوں (حسن و حسین رضی اللہ عنہما) دنیا میں میرے دو پھول ہیں۔'' (صحيح البخاري: 5994)

㉜ شہر بن حوشب سے روایت ہے کہ میں نبی ﷺ کی زوجہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس موجود تھا، میں نے سیدنا حسین کی شہادت کی خبر سنی تو ام سلمہ کو بتایا، انھوں نے فرمایا: ان لوگوں نے یہ کام کر دیا ہے، اللہ ان کے گھروں یا قبروں کو آگ سے بھر دے اور وہ بے ہوش ہو گئیں۔

(تاريخ دمشق: 229/14)

㉝ سیدہ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں نے جنوں کو حسین رضی اللہ عنہ (کی شہادت) پر روتے ہوئے سنا ہے۔ (المعجم الكبير للطبراني: 89/3)

㉞ حسین رضی اللہ عنہ کو جب شہید کیا گیا تو آپ کا سر عبیداللہ بن زیاد کے سامنے لایا گیا تو وہ ہاتھ کی چھڑی کے ساتھ آپ کے سر کو کریدنے لگا۔ یہ دیکھ کر انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حسین رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے زیادہ مشابہ تھے۔ (صحيح البخاري: 3748)

㉟ ہلال بن اساف (ثقہ تابعی) سے روایت ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ شام کی طرف یزید (بن معاویہ بن ابی سفیان) کی طرف جا رہے تھے، کربلا کے مقام پر انھیں عمر بن سعد، شمر بن ذی الجوشن اور حصین بن نمیر کے لشکر ملے۔ حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے یزید کے پاس جانے دو تاکہ میں اس کے ہاتھ پر بیعت کر لوں۔ انھوں نے کہا: نہیں ابن زیاد کے فیصلے پر اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔ (انساب الأشراف للبلاذري: 415/1)

㊱ سعد بن عبیدہ (ثقہ تابعی) بیان کرتے ہیں کہ میں نے حسین رضی اللہ عنہ کو دیکھا، آپ ایک کپڑے کا جبہ پہنے ہوئے تھے، عمرو بن خالد الطہوری نامی ایک شخص نے آپ کو مارا جو آپ کے چوغے سے لٹک رہا تھا۔ (تاريخ دمشق لابن عساكر: 214/14)

㊲ تابعی صغیر ابراہیم بن یزید النخعی نے فرمایا: اگر میں ان لوگوں میں ہوتا جنھوں نے حسین بن علی کو شہید کیا تھا، پھر میری مغفرت کر دی جاتی اور میں جنت میں داخل ہو جاتا تو میں نبی ﷺ کے پاس گزرنے سے شرم کرتا کہ کہیں آپ میری طرف دیکھ نہ لیں۔ (المعجم الكبير للطبراني: 112/3)

㊳ ابو رجاء العطاردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: علی اور اہل بیت کو برا نہ کہو، ہمارے بلجیم کے ایک پڑوسی نے حسین رضی اللہ عنہ کو برا کہا تو اللہ تعالیٰ نے اسے اندھا کر دیا۔ (المعجم الكبير: 112/3)

㊴ امام ابو جعفر باقر رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ سیاہ خضاب سے اپنے بالوں کو رنگ دیتے تھے۔ (المعجم الكبير للطبراني: 22/3، و معرفة الصحابة لأبي نعيم الأصبهاني: 1750)

㊵ جب حسین رضی اللہ عنہ عراق جا رہے تھے تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان سے معانقہ کیا اور یہ دعا دی: أَسْتَوْدِعُكَ اللّٰهَ وَالسَّلَام (صحيح ابن حبان: 58/9)

سیدنا حسن بن علی اور حسین بن علی رضی اللہ عنہما اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت جزو ایمان ہے۔ اے اللہ! ہمارے دلوں کو تمام صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور سلف صالحین کی محبت سے بھر دے۔ (آمین)

بدعنوانی اور احتساب

تاریخی واقعات اور بہترین شرعی راہ نمائیاں





حافظ محمد حق نواز
ریسرچ فیلو، دارالسلام

بدعنوانی اور اس کی قباحتیں

''روزمرہ زندگی میں بدعنوانی سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ ایک سرکاری افسر اپنے سرکاری اختیارات کا ناجائز استعمال کر کے عوام سے فالتو دولت ہتھیا لے۔'' بدعنوانی کا تصور سرکاری افسروں کے علاوہ معیشت و معاشرت کے دیگر اراکین پر بھی محیط ہے، مثلاً: سیاست دان، ٹریڈ یونین لیڈر، صحافی، تعمیری فنون کے اراکین، انتخاب کنندگان اور خصوصاً اہل صنعت و حرفت وغیرہ۔

بدعنوانی ایسا قبیح معاشرتی فعل ہے جس میں مندرجہ ذیل میں سے کوئی ایک یا چند ایک مشترک عناصر کسی نہ کسی رنگ میں ضرور کارفرما ہوتے ہیں:

① کسی صورت حال میں حسب منشا ردو بدل، ترمیم و تخصیص کر کے ناجائز ذاتی منفعت کی کوئی نہ کوئی صورت نکال لینا۔ ② اقتدار میں فتور رونما ہونا۔ ③ اختیارات کا غلط استعمال کر کے عوام سے مال بٹورنا۔ ④ خویش پروری، اقربانوازی اور کنبہ پروری کا مرتکب ہونا۔ ⑤ لیاقت اور انصاف کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر سرکاری امور میں تعصب اور طرفداری کا سہارا لینا۔ ⑥ مجرمانہ ''افہام و تفہیم'' اور سودے بازی کے رجحان کا اظہار کرنا۔ رشوت ''تحفے تحائف'' اور ''نذرانہ ہائے عقیدت'' وغیرہ بلا تأمل وصول کرنا۔ ⑦ راشیوں، بدکاروں، پیشہ ور دلالوں، طاقتور سیہ کاروں اور بداخلاق لوگوں کی اعانت کرنا یا ان کے اثر و رسوخ یا دباؤ تلے دب کر سرکاری فیصلے کرنا وغیرہ۔

بدعنوانی کی صورتیں

ہمارے معاشرے میں بدعنوانی کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں، مثلاً: طرفداری، خویش پروری، اقربانوازی، حسب منشا چھوٹے موٹے تصرفات اور اجتہادات کا ارتکاب کرنا۔ تحائف وصول کرنا، اپنے ''اعزاز'' میں دی گئی ضیافتوں اور پارٹیوں میں شرکت کرنا اور عواقب سے بے پروائی برتنا۔ اہل کاروں کے تقرر، ترقی اور احتساب وغیرہ میں غیر منصفانہ رویہ اختیار کرنا، سرکاری سامان کی خرید و فروخت اور ٹھیکے دینے میں مروجہ اصولوں سے انحراف کرنا۔ فرائض کی ادائیگی اور احکام صادر کرنے میں ذاتی مفاد کی تشفی کرنا۔ ٹھیکہ جات میں ردی مال کا استعمال کرنا، قیمت خرید کو بل میں بڑھا چڑھا کر پیش کرنا۔ متعلقہ افسر کی بلا جھجک رشوت ستانی میں ہمہ تن مصروف نظر آنا۔

علاوہ ازیں بدعنوانی اور کرپشن کی کئی صورتیں رائج ہو چکی ہیں، مثلاً: انفرادی کرپشن، اجتماعی کرپشن، بڑے بڑے حکومتی اداروں (ریلوے اور پی آئی اے وغیرہ) میں خرد برد، حج پیکج میں غبن اور ٹریول ایجنسیوں کی کرپشن وغیرہ نمایاں ہیں۔

ناجائز طریقے سے حاصل کیا گیا مال، خواہ وہ کرپشن، رشوت، بدعنوانی، سود، دھوکے اور فراڈ کی کوئی بھی صورت ہو، حرام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ ''اور تم اپنے مال آپس میں ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ۔'' (البقرۃ 188:2)

سیدنا عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حکومتی عہدیدار یا جج جب تک ظلم نہ کرے اللہ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب وہ ظلم کا ارتکاب شروع کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے نفس کے حوالے کر دیتا ہے۔'' (سنن ابن ماجہ: 2312) یہی نہیں بلکہ ایسے لوگ اللہ اور اس کے رسول کی لعنت کے بھی مستحق بن جاتے ہیں، چاہے ظلم پر مبنی فیصلہ رشوت لے کر کیا ہو یا کسی



کی سفارش کی بنا پر۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے منقول ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔'' (سنن أبی داود: 3580)

رشوت

ابن العربی نے رشوت کی تعریف یوں کی ہے: ''ہر وہ مال جو کسی بھی عہدیدار کو اس مقصد کے لیے دیا جائے کہ اس کے تعاون سے کوئی ناجائز کام کروایا جاسکے، یعنی وہ مال جو ابطال حق یا احقاق باطل یا اپنے مفاد کو پورا کرنے کے لیے کسی کو دیا جائے اسے بدعنوانی، رشوت یا Corruption کا نام دیا جاتا ہے۔''

بدعنوانی ایمانداری اور نیکی کے عدم وجود کا نام ہے۔ عام طور پر امن و امان سے عاری معاشرہ بدعنوان معاشرہ ہوتا ہے۔ ایسے معاشروں میں لوگ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے ادا نہیں کرتے اور اپنے ذاتی مفاد کے لیے کام کرتے ہیں۔ بدعنوان عناصر قانون کی پابندی نہیں کرتے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے غلط ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ وہ اخلاق اور اچھے طریقوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ معاشرہ جہاں ایسے لوگوں کی کثرت ہو بدعنوان (Corrupt) معاشرہ کہلاتا ہے۔

بدعنوانی اور کرپشن کا آغاز روپے پیسے یا کسی ادنیٰ چیز کی خیانت سے ہوتا ہے۔ انسان پہلے اپنے والدین کے گھر اور خاندان، دوست احباب، دکان اور ادارے کی چھوٹی موٹی چیزیں دوسروں کی نگاہوں سے بچا کر ناجائز طور پر اپنے مصرف میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب وہ اپنے اس عمل میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ پھر جب وہ صاحب اختیار بن جاتا ہے تو پھر اربوں کھربوں کی کرپشن کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور یوں وہ کرپٹ انسان بن جاتا ہے۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد مال و دولت اکٹھا کرنا بن جاتا ہے، حلال و حرام کی تمیز اس کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی۔

بدعنوانی تقریباً تمام شعبہ ہائے زندگی میں رائج ہوچکی ہے۔ بدعنوانی نے ہمارے معاشرے کو تباہ و برباد کردیا ہے۔ بدعنوان (رشوت خور Corrupt) افراد یا اعلیٰ افسران کی وجہ سے ایمان دار آدمی بھی رشوت دینے پر مجبور ہے۔ رشوت اور بدعنوانی نے ہمارے ملک کی مضبوط جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔

عہدے دار کے لیے تحائف

بعض لوگ حکمرانوں، ججوں یا کسی بھی حکومتی عہدیدار کو تحفے تحائف کی صورت میں رشوت دے کر خوش کرتے ہیں اور ان سے عین موقع پر یا کسی دوسرے موقع پر جائز، ناجائز سب کام کرواتے ہیں، جو لوگ اس طریقے سے لوگوں سے مال وصول کرتے ہیں اور پھر ان کی نظروں میں بلیک میل ہوکر غلط فیصلہ کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں وہ بد دیانتی اور خیانت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ان کا احتساب ضروری ہے۔

سیدنا ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ابن لتبیہ کو بنی سلیم کے صدقات کی وصولی کے لیے عامل بنا کر بھیجا۔ جب وہ آپ ﷺ کے پاس واپس آئے اور آپ ﷺ نے ان سے حساب طلب فرمایا تو انھوں نے کہا: ''یہ تو آپ لوگوں کا ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے۔'' اس بیان پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''پھر تم اپنے ماں باپ کے گھر کیوں نہ بیٹھے رہے اگر تم سچے ہو تو وہاں بھی تمھارے پاس ہدیہ آتا۔'' پھر آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور لوگوں کو خطبہ دیا۔ آپ ﷺ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا: ''اما بعد! میں کچھ لوگوں کو بعض ان کاموں کے لیے عامل بناتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے سونپے ہیں پھر تم میں سے کوئی ایک آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ مال تمھارا ہے اور یہ ہدیہ ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔ اگر وہ سچا ہے تو پھر کیوں نہ وہ اپنے باپ یا اپنی ماں کے گھر میں بیٹھا رہا تاکہ وہیں اس کا ہدیہ پہنچ جاتا۔ رب العالمین کی قسم! تم میں سے کوئی اگر اس مال میں سے کوئی چیز ناحق لے گا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے اس طرح لائے گا کہ وہ اس کو اٹھائے ہوئے ہو گا۔ خبردار! میں اسے پہچان لوں گا جو اللہ کے پاس وہ شخص لے کر آئے گا۔ اونٹ جو آواز نکال رہا ہوگا یا گائے جو اپنی آواز نکال رہی ہوگی یا بکری جو اپنی آواز نکال رہی ہوگی۔'' آخر میں آپ ﷺ نے ہاتھ بلند کر کے فرمایا: ''کیا میں نے پہنچا دیا؟'' (صحیح البخاری: 7197)

جس حکومت، ادارے، جماعت یا فیکٹری کے عمال اور افسر بددیانت ہوں گے اس کا خمیازہ ایک نہ ایک دن سب کو بھگتنا پڑے گا۔ اسی لیے آپ ﷺ نے اتنی سختی کے ساتھ اپنے اس عامل سے باز پرس فرمائی اور اس کی بددیانتی پر آپ ﷺ نے سخت لفظوں کے ساتھ اسے ڈانٹا۔



ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیز (خلیفہ) کے دل میں سیب کھانے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن ان کے پاس سیب خریدنے کے لیے پیسے نہ تھے۔ راستے میں چلتے ہوئے انھیں چرچ میں سے نکل کر چند لڑکوں نے ٹرے میں سیب رکھ کر بطور ہدیہ پیش کیے۔ عمر بن عبدالعزیز نے ان سیبوں میں سے ایک سیب اٹھا کر سونگھا اور پھر واپس رکھ دیا۔ اور فرمایا: ''مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' ساتھیوں نے پوچھا: کیا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما لوگوں سے تحفے تحائف وصول نہیں کرتے تھے؟ کہنے لگے: ''ان لوگوں کے لیے واقعتاً یہ ہدیہ ہی ہوتے تھے جبکہ ان کے بعد خصوصاً ہمارے زمانے میں لوگ ہدیہ کو رشوت سمجھ کر دیتے بھی ہیں اور لیتے بھی ہیں لہٰذا موجودہ دور میں کسی بھی عہدیدار کے لیے اس قسم کے تحائف قبول کرنا جائز نہیں ہے۔''

(فتح الباری: 271/5)

جلیل القدر تابعی سیدنا مسروق رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قاضی یا حکومتی عہدیدار نے جب کسی ایسے شخص سے ہدیہ وصول کیا (جو اسے ہمیشہ سے ہدیہ نہ دیتا تھا بلکہ اس کے سرکاری عہدے پر فائز ہونے کے بعد دینے لگا ہے) تو اس نے حرام کھایا اور جب رشوت لی تو کفر کے قریب پہنچ گیا.....۔'' (سنن النسائی: 5668)

بدعنوانی کی کئی وجوہات ہیں تاہم اس کی سب سے بڑی وجہ زیادہ سے زیادہ طلب زر ہے۔ لوگ سوچتے ہیں کہ خوشحالی کے حصول کے لیے بدعنوانی مختصر راستہ ہے۔ وہ اس کے حصول کے لیے مختلف بری راہیں اختیار کرتے ہیں۔

کرپٹ اور بدعنوان لوگ جس طریقے سے لوگوں سے مال وصول کر کے اپنے بینک بیلنس میں اضافہ کر رہے ہیں، بدعنوانی، رشوت، سود اور دیگر ناجائز ذرائع سے اکٹھا کیا گیا مال تو سراسر حرام مال کا مجموعہ ہے، ان کے لیے یہ مال کس قدر وبال جان بنے گا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک شخص کا مال حلال ذرائع سے کمایا گیا ہے لیکن وہ اپنے مال سے صدقہ اور زکوٰۃ نہیں نکالتا۔ صدقہ و زکوٰۃ غرباء کا حق ہے۔ غریبوں کا حق وہ خود کھا رہا ہے۔ اس لیے وہ مال بھی اس کے لیے وبال جان بن جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ.يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ﴾ ''لوگوں کا مال ناحق ہی کھاتے ہیں اور وہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، تو آپ انھیں درد ناک عذاب کی خبر سنا دیں۔ جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس سے ان کے ماتھوں، ان کے پہلوؤں اور ان کی پیٹھوں کو داغا جائے گا (اور کہا جائے گا:) یہ وہ (مال) ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کر کے رکھا تھا، لہٰذا (اب اس کا مزہ) چکھو جو تم جمع کرتے رہے تھے۔'' (التوبۃ 9:34,35) دوسرے مقام پر فرمایا: ''جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ بے شک اس کا مال اسے ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ ہرگز نہیں! اسے ضرور حُطَمَہ میں پھینکا جائے گا۔ اور آپ کو کیا معلوم کہ حُطَمَہ کیا ہے؟ وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔'' (الھمزۃ 104:2-6)

بدعنوان لوگوں کا کردار

انسان نیک فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی معصومیت کھو دیتا ہے اور شیطان کا چیلا بن جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی چیز ہے جو اسے اپنی فطری نیکی کھو دینے پر مجبور کر دیتی ہے؟ عام طور پر ہم سارا الزام حالات پر دھر دیتے ہیں لیکن ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ کیا انسان حالات کی پیداوار ہے یا وہ خود حالات پیدا کرتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ خالق کائنات نے انسان کی فطرت میں اچھائی اور برائی دونوں عناصر رکھ دیے ہیں۔ انسان ان دونوں میں سے کسی ایک کو اپنانے کے لیے آزاد اور خود مختار ہے۔ وہ لوگ جنھیں اللہ کی ذات پر پختہ یقین ہوتا ہے وہ برائی کے راستے پر نہیں چلتے۔ وہ زندگی کی ہر مصیبت کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں اس یقین کے ساتھ کہ انھیں ان کی نیکی کا اجر ملے گا۔ اور وہ لوگ جن کا ایمان کمزور ہوتا ہے اور وہ مادی دنیا کی آسائشوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں



آسانی سے برائی کا شکار ہوجاتے ہیں۔

بدقسمتی سے دوسری قسم کے لوگ زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے مفادات کو اپنے ملک، اپنے ہمسائے حتی کہ اپنے عزیز واقارب کے مفادات پر ترجیح دیتے ہیں۔ جھوٹ، تنگ نظری، اکھڑپن، بدعنوانی، بددیانتی، ذخیرہ اندوزی، منافع خوری اوراقربا پروری جیسی برائیوں کولوگ اپنے دنیاوی آرام و آسائش کے حصول کے لیے بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں خواہ وہ تعلیم ہو، طب ہو، کاروبار ہو یا سرکاری ملازمت، آپ لوگوں کی اکثریت کو اپنے فرائض سے پہلو تہی کرتے، رشوت لیتے اور فنڈز و اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے، اپنے ساتھیوں اور ماتحتوں کے ساتھ نازیبا رویہ اختیار کرتے اور گھٹیا باتوں میں اپنا وقت ضائع کرتے پائیں گے۔ دوسروں کا مذاق اڑانا اور غیبت کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے، اسی طرح دولت، عورت اور شہرت کے بارے میں باتیں کرنا بھی ان کا بہترین مشغلہ ہے۔ اسلام ہمیں دوسروں کو دکھ دینے سے روکتا ہے لیکن یہی وہ کام ہے جو زندگی میں ہم زیادہ تر اوقات میں کرتے رہتے ہیں۔ ہم اپنے والدین کو برا بھلا کہتے ہیں۔ ہمسائیوں کے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ ملازموں کے حقوق نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہم محنت سے جی چراتے ہیں اور ناجائز اور آسان ذرائع سے دولت کے ڈھیر لگانے کے خواہش مند ہیں۔ نتیجتاً ہمارے معاشرے میں بدعنوانی، رشوت ستانی اور دھوکا دہی کا راج ہے۔ کمزور روز بروز کمزور تر ہوتے جا رہے ہیں اور امیر لوگ امیر تر ہوتے جا رہے ہیں۔

بددیانت افسر شاہی (بیوروکریسی)

سرکاری محکموں کی نگرانی اوران کے نظم ونسق پر عموماً بددیانت اور غیر ذمہ دار افسران مامور ہیں، وہ سیاسی لیڈروں کی مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور عوام سے متکبرانہ انداز میں برتاؤ کرتے ہیں۔ وہ رشوت اور اقربا پروری کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ لوگوں کو ملازمتیں رشوت اورناجائز نذرانوں کی بنیاد پر دی جاتی ہیں۔ حق استحقاق کوکلی طور پر نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ بددیانت افسر شاہی رشوت خور سیاسی لیڈروں سے مل کر کاغذی کارروائی مکمل کر کے حکومتی خزانوں سے کروڑوں، اربوں نکلوا کر حکومتی خزانوں کونقصان پہنچاتے ہیں۔

بدعنوانی کے خاتمے کے اقدامات

رشوت اور بددیانتی کو ختم کرنے کے لیے بہت سے اقدامات کی ضرورت ہے: ① مردوں کو تعلیم یافتہ بنایا جائے۔ ② بددیانت افسران کو فوری سزا دی جائے۔ ③ رشوت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور رائے عامہ کو قائل کرنے کے لیے الیکٹرانک میڈیا اپنا بھرپور کردار ادا کرے۔ ④ ارشاد نبوی ہے: ''تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں بازپرس ہوگی۔'' لہٰذا ہر ایک کے لیے اپنے اپنے دائرۂ کار میں ماتحتوں کا احتساب کرنا ضروری ہے۔ ⑤ مرنے کے بعد رب کے سامنے جواب دہ ہونے کا احساس اجاگر کیا جائے۔

ہمیں اپنے بچوں کی تربیت اسلامی طریقے پر کرنی چاہیے۔ بچپن سے ہی انھیں جھوٹ بولنے اور خیانت کرنے سے باز رکھنا چاہیے، سچ بولنے اورامانت و دیانت کا ثبوت دینے پر بچوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ بچوں کو جب کوئی چیز خریدنے کے لیے بھیجیں تو واپسی پر ان سے بقایا کا پورا پورا حساب لینا چاہیے اور ساتھ ساتھ انھیں اس بات کی تلقین بھی کرنی چاہیے کہ ہم نے بعینہ اپنے رب کے حضور اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب دینا ہے۔ بچوں کواس بات کا عادی بنایا جائے کہ روزانہ رات کو سونے سے پہلے دن بھر کیے گئے اپنے اعمال کا جائزہ لیں کہ آج میں نے نیک اعمال کتنے کیے ہیں اور برے اعمال کتنے کیے ہیں۔ اس طریقے پر جب ہم بھی روزانہ اپنا احتساب کریں گے اور برے اعمال کم کرتے جائیں گے تو ان شاء اللہ ہماری زندگی میں ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ ہم برے اعمال ترک کر چکے ہوں گے۔

احتساب

احتساب سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص جتنے اہم عہدے پر فائز ہو اس سے اپنے فرائض منصبی کے منافی اقدامات کرنے پر اتنی ہی سختی سے بازپرس کی جائے، احتساب کا یہی تصور اسلامی طرز حکومت کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اسلام کے زریں عہد میں چاروں خلفاء اپنے



اپنے دور حکومت کے دوران احتساب کے ادارے کو درست تسلیم کرتے اور اسے تقویت پہنچاتے رہے۔ تمام خلفاء اپنے قول وفعل کے بارے میں عوام کے سامنے جواب دہ ہوتے تھے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کئی مواقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے عوام نے سختی سے باز پرس کی مگر انھوں نے اس پر خوشی اور فخر کے جذبے کے ساتھ خود کو احتساب کے لیے پیش کر دیا۔ انھوں نے اس پر کبھی ناراضگی اور غصے کا اظہار نہیں کیا۔ وہ عوام کو مطمئن رکھنے کے لیے احتساب کو لازمی تصور کرتے تھے۔

خلفاء اور حکومتی عہدیداران کے خلاف عدالت میں اگر کوئی مقدمہ دائر کیا جاتا تو عدلیہ کا احترام کرتے ہوئے حکومتی اعلیٰ عہدیداران حتی کہ خلیفۂ وقت قاضی کی عدالت میں بذات خود پیش ہوتا اور قاضی کا ہر فیصلہ خندہ پیشانی سے قبول کرتا تھا، چند مثالیں آپ کے سامنے مختصراً پیش کی جاتی ہیں:

خلیفہ وقت کے خلاف فیصلہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ گم ہوگئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعینہ وہی زرہ کچھ عرصے بعد ایک یہودی کے پاس دیکھی اور یہ معاملہ قاضی کے سامنے پیش کر دیا، چنانچہ قاضی شریح نے طرفین کے دلائل سنے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دعویٰ کی تصدیق بھی کر دی لیکن قانون کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ سے گواہ طلب کیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بطور گواہ اپنا ایک غلام اور دو بیٹے (حسن وحسین رضی اللہ عنہما) پیش کیے۔ قاضی صاحب نے فرمایا: ''غلام کی گواہی تو قبول ہے لیکن بیٹوں کی گواہی باپ کے حق میں قبول نہیں کر سکتا۔'' گواہوں کی عدم موجودگی کی بنا پر قاضی صاحب نے یہودی کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ بعد میں یہودی نے اعتراف کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دعویٰ کی تصدیق کی اور زرہ ان کو واپس کر کے مسلمان ہوگیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میری یہ زرہ اور میرا یہ گھوڑا بھی تمھارا ہوا۔'' (کنز العمال: 17790، و حلیۃ الأولیاء لابن الجوزی)

بدعنوان گورنر کا احتساب

خلیفہ وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے۔ ایک آدمی نے گزرتے ہوئے کہا: ''اے عمر! آپ اپنے حکام کو مقرر کرتے وقت ان سے شرائط قبول تو کرواتے ہیں مگر ان کا محاسبہ نہیں کرتے کہ انھوں نے شرائط پوری کی ہیں یا نہیں؟ مصر میں آپ کا حاکم آپ کی شرائط فراموش کر کے ان باتوں کا ارتکاب کر رہا ہے جن سے آپ نے منع فرمایا ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شکایات کی تصدیق وتحقیق کے بعد ازالے کے لیے مصر کے گورنر کو فوراً بلا بھیجا۔ گورنر جب خلیفہ کی خدمت میں احتساب کے لیے حاضر ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے مخاطب کر کے فرمایا: ''تیرا ناس ہو! جن باتوں سے تجھے منع کیا گیا تھا ان کو تو نے گلے لگا لیا مگر جن باتوں کا تجھے حکم دیا گیا تھا ان کو فراموش کر بیٹھا۔ اللہ کی قسم! میں تجھے ضرور عبرتناک سزا دوں گا۔'' پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھٹا ہوا لباس پہنا کر اور اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھما کر صدقے کے مال میں سے 300 بکریوں کا ریوڑ اس کے حوالے کیا اور چرواہا بنا کر روانہ کر دیا۔ سخت گرمی میں بکریاں چرا کر جب واپس لوٹا تو امیر المومنین نے اسے بلا کر پوچھا: سمجھے یا نہیں؟ وہ فوراً زمین پر گر گیا اور کہنے لگا: ''اے امیر المؤمنین! یہ کام مجھ سے نہیں ہوسکتا چاہے آپ میری گردن اڑا دیں۔'' امیر المؤمنین نے فرمایا: ''اگر میں نے تمھیں گزشتہ منصب پر بحال کر دیا تو پھر کس طرح کے آدمی بنو گے؟'' وہ کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! اب اس کے بعد آپ کو وہی رپورٹ ملے گی جو آپ پسند کریں گے۔'' اس کے بعد وہ مصر کا ایک مثالی حاکم بن کر اپنی ذمہ داریاں خوف وتقوٰی اور اخلاص کے ساتھ انجام دینے لگا۔ (قصص العرب: 3/16-17)

رشوت خور قاضی کی سزا

خلیفہ وقت متوکل علی اللہ کے زمانے میں مصر کا قاضی القضاۃ ابوبکر محمد بن ابو اللیث نہایت ہی ظالم، سخت گیر اور رشوت خور (Corrupt) تھا۔ انصاف نہ ہونے کی وجہ سے عام لوگ اس کے ہاتھوں نالاں تھے۔ حاکم مصر کے پاس لوگوں نے اس کی شکایات کیں مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ آخر کار تنگ آ کر بعض لوگ حاکم مصر کی چشم پوشی اور قاضی کے ظلم وستم کی داستانیں لے کر خلیفہ متوکل علی اللہ کی خدمت میں بغداد پہنچ گئے۔ متوکل نے تمام شکایات بغور سنیں اور تحقیق کا حکم دیا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ لوگ واقعی اس سے نالاں ہیں تو قاضی صاحب کو دربار خلافت میں



بلا کر ایسی سخت سزا دی کہ لوگ برسوں اس عبرت انگیز سزا کاذکر کرتے رہے۔ قاضی صاحب کی داڑھی اور سر کے بال منڈوا کر اس کو گدھے پر سوار کرایا اور اس کی اس ذلت آمیز حالت کا شہر بھر میں چرچا کروایا اور کئی دنوں تک روزانہ 20 کوڑے اس کو لگائے جاتے رہے۔ خلیفہ نے اس کی جگہ نیا قاضی مقرر کر دیا۔(تاریخ الخلفاء للسیوطی:301-302)

بعد میں جوں جوں خلافت بادشاہت میں تبدیل ہوتی گئی احتساب کے ادارے کو زوال آتا گیا۔ بادشاہ عوام کے سامنے جواب دہ ہونے کی زحمت گوارہ نہ کرتے اور سرکاری وسائل کو اپنے ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرتے رہتے تھے۔

رشوت کا اثر و کردار

عباسی خلیفہ مہدی کے زمانے میں عاقبہ بن یزید بغداد میں بحیثیت قاضی مقرر تھے۔ اچانک ایک دن خلیفہ کی خدمت میں استعفیٰ پیش کردیا۔ خلیفہ نے وجہ پوچھی تو قاضی صاحب نے بتایا: میرے پاس ایک پیچیدہ نوعیت کا مقدمہ آیا۔ فریقین کے پاس واضح ثبوت اور شہادتیں موجود تھیں اس لیے فیصلہ کرنے کی بجائے انھیں آپس میں صلح کرنے کے لیے واپس بھیج دیا۔ دونوں میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرنا مشکل تھا کیونکہ دونوں برابر تھے۔ اس دوران کسی ایک کو معلوم ہو گیا کہ پکی ہوئی تازہ کھجوریں مجھے زیادہ مرغوب ہیں۔ چنانچہ اس نے انتہائی عمدہ کھجوروں کا ایک تھال میری خدمت میں پیش کرنے کے لیے دربان کو بھی بھاری رقم بطور رشوت دی۔ دربان وہ ہدیہ لے کر پہنچا۔ میں نے وہ کھجوریں دیکھیں اور دربان کو ڈانٹ ڈپٹ کر واپس کروا دیں۔ دوسرے دن عدالت میں جب دونوں فریق حاضر ہوئے تو میری نگاہ میں دونوں فریق یکساں نظر نہیں آرہے تھے۔ ''امیر المومنین! ہدیہ قبول نہ کرنے کے باوجود میری یہ حالت ہوگئی (کہ عدم مساوات کا تیر میری نگاہ میں چبھ گیا) پھر اگر میں نے ہدیہ قبول کرلیا ہوتا تو کیا ہوتا؟ (لامحالہ مجھے ناحق فیصلہ کرنا پڑتا!!) میں اپنی عاقبت برباد نہیں کر سکتا لہٰذا اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دیں، اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا اور اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے گا۔''(قصص العرب: 75/3)

ضرورت اس امر کی ہے کہ ڈاکو، جاگیرداروں اور رسہ گیروں کو جواب دہی کے لیے لازماً انصاف کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا جائے اور انھیں سزا دی جائے اور ناجائز طور پر لوٹی ہوئی دولت ان سے اصل حقداران کو واپس دلائی جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کو واپس کردو، اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔''(النسآء 58:4)

ہمیں اپنے ملک سے بدعنوانی، رشوت اور کرپشن کے خاتمے کے لیے مل جل کر جدوجہد کرنا ہوگی۔ اگر ہم نے کوئی سنجیدہ قدم نہ اٹھایا تو یاد رکھیں ہمارا انجام بہت برا ہوگا۔ اس دنیا میں نہ سہی لیکن قیامت کے دن ہم سب کو فرداً فرداً اپنے رب کے سامنے احتساب کے لیے پیش ہونا ہے۔ ہماری ساری کرپشن، بدعنوانیاں اور برے اعمال ہمارے سامنے ہوں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَ يَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا﴾ ''اور (ہر ایک کا) اعمال نامہ (سامنے) رکھ دیا جائے گا، پھر آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ وہ اس کے مندرجات (تحریر) سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے: ہائے ہماری کم بختی! کیسا ہے یہ اعمال نامہ جو نہیں چھوڑ رہا کسی چھوٹے اور نہ بڑے (عمل) کو مگر اس نے اسے شمار کر رکھا ہے۔ اور انھوں نے جو عمل کیے تھے حاضر پائیں گے۔ اور آپ کا رب کسی پر بھی ظلم نہیں کرے گا۔''(الکھف 49:18)

سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''زیرک انسان وہ ہے جو اپنے نفس کو فرمانبردار بنالے اور مرنے کے بعد جواب دہ ہونے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرلے اور وہ شخص انتہائی عاجز ہے جس نے اپنے نفس کو خواہشات کا پیروکار بنالیا اور پھر بھی اللہ سے امید لگا کر بیٹھ گیا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''قیامت کے دن کے محاسبے سے پہلے پہلے اپنے نفسوں کا محاسبہ کرلو اور رب کے حضور اپنے اعمال کی پیشی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرلو، جس شخص نے دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کرلیا قیامت کے دن اس کا حساب ہلکا ہو جائے گا۔''(جامع الترمذی: 2459)

مروجہ جہیز کی شرعی حیثیت

ایک اہم مسئلے کا متوازن حل

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ
مدیر: شعبۂ تحقیق وتالیف دارالسلام، لاہور





شادی کی رسومات میں ایک رسم جہیز بھی ہے، یہ رسم البتہ ایسی ہے کہ اس کی اصل حیثیت میں اختلاف ہے کہ یہ واقعی دیگر غیر ضروری رسومات کی طرح ایک رسم محض ہے یا کسی لحاظ سے اس کا شرعی جواز بھی ہے؟

ہمارے نزدیک اس رسم کے دو پہلو یا دو رخ ہیں یا دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت میں اس کا جواز ہے اور دوسری صورتوں میں ناجائز۔

اس کو سمجھنے کے لیے ان صورتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے جن کے پیش نظر جہیز کا اہتمام کیا جاتا ہے، یہ حسب ذیل ہیں:

① شان وشوکت یا امارت کا اظہار ② نمودو نمائش، شہرت اور تفاخر کا اظہار ③ اسراف و تبذیر کی حد تک اس کا اہتمام ④ وراثت سے محروم کرنے کا جذبہ ⑤ محض ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی رسم کے طور پر ⑥ عدم استطاعت کے باوجود قرض لے کر اس کا اہتمام کرنا۔ ⑦ تعاون، ہدیہ اور صلہ رحمی کے طور پر

اول الذکر ساری چھ کی چھ صورتوں میں یہ ایک محض رسم ہے، اس لیے ناجائز ہے۔ اور اس ناجائز صورت میں اکثر وبیشتر مذکورہ ساری ہی خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ جہیز کی رسم تمام مذکورہ خرابیوں کا مجموعہ ہے۔ اسے کس طرح جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟ اس میں

- شان وشوکت کا اظہار بھی ہوتا ہے نمودو نمائش کا جذبہ بھی۔
- اسراف وتبذیر کی حد تک اس کا اہتمام کیا جاتا ہے، اسی لیے ہر چیز دینے کی کوشش کی جاتی ہے چاہے ان کی ضرورت ہو یا نہ ہو اور لڑکے والوں کے پاس اتنا غیر ضروری سامان رکھنے کی جگہ بھی ہو یا نہ ہو۔
- جس کے پاس استطاعت نہیں ہوتی، وہ قرض لے کر حتی کہ قرض حسن نہ ملے تو سود پر



قرض لے کر یہ رسم پوری کرتا ہے۔

- بھرپور جہیز دینے میں وراثت سے محروم کرنے کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے۔ بالخصوص اصحاب حیثیت اسی نیت سے لاکھوں روپے جہیز کی نذر کر دیتے ہیں اور پھر واقعی ان کے بیٹے اپنے صاحب جائیداد باپ کی وفات کے بعد اپنی بہنوں کو وراثت سے ان کا شرعی حق نہیں دیتے اور یہی کہتے اور سمجھتے ہیں کہ باپ نے جہیز کی صورت میں اپنی بیٹیوں کو جو دینا تھا دے دیا، اب یہ ساری جائیداد صرف بیٹوں کی ہے۔ اس طرح یہ رسم ہندوؤں کی نقل ہے۔ ہندو مذہب کے ہاں وراثت میں لڑکیوں کا حصہ نہیں ہے، اس لیے وہ شادی کے موقع پر لڑکی کو دان دے دیتے ہیں۔

یہی دان کا تصور (وراثت سے محرومی کا بدل) مسلمانوں میں جہیز کے نام سے اختیار کر لیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ خالص ہندوانہ رسم ہے۔

اگر جہیز میں مذکورہ تصورات کارفرما ہوں تو جہیز کی یہ رسم سراسر ناجائز ہے، اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے اس کے خلاف بھی جہاد ضروری ہے کیونکہ جہیز دینے والے بالعموم ایسے ہی تصورات کے تحت جہیز دیتے ہیں اور اس رسم کو بھی پورا کرنا ناگریز سمجھتے ہیں۔

جہیز کی جائز صورت

البتہ جہیز کی ایک جائز صورت بھی ہے جس کا ذکر ساتویں شکل میں بیان کیا گیا ہے اور وہ ہے تعاون، صلۂ رحمی اور ہدیے (تحفے، عطیے) کے طور پر اپنی لڑکی کو شادی کے موقع پر کچھ دینا۔

اسلام میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کی بڑی فضیلت ہے، اسی طرح ایک دوسرے کو ہدیہ، تحفہ دینے کی بھی ترغیب ہے۔ اور اگر تعاون یا ہدیے کا معاملہ اپنے قریبی رشتے داروں سے کیا جائے تو اس کو صلہ رحمی کہا جاتا ہے۔ اور اس کی بھی بڑی تاکید ہے اور اس کو دگنے اجر کا باعث بتلایا گیا ہے۔

اس اعتبار سے اپنی بچی کو، اگر وہ واقعی ضرورت مند ہے یا بطور تحفہ، کچھ دینا بالکل جائز ہے، بلکہ مستحسن اور پسندیدہ ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ

- بچی ایسے گھرانے میں جا رہی ہے جہاں واقعی اس کو گھریلو معاملات میں کچھ چیزوں کی یا آج کل کی نو ایجاد تمدنی سہولتوں کی ضرورت ہے۔
- والدین اپنی طاقت کے مطابق اس کی ضروریات پوری کریں۔
- نمائش اور رسم کے طور پر ایسا نہ کریں۔
- ضروریات زندگی کی اس فراہمی میں شادی سے پہلے یا شادی کے موقع پر ضروریات کا جائزہ لیے بغیر تعاون کرنا جائز نہیں ہوگا۔ بلکہ شادی کے بعد دیکھا جائے کہ اس گھر میں کن چیزوں کی ضرورت ہے اور لڑکے والے ان کو مہیا کرنے سے واقعی قاصر ہیں، تو ان کو وہ اشیاء مہیا کرنے میں حسب استطاعت ان سے تعاون کیا جائے۔ لیکن حسب ذیل شرائط کے ساتھ:
- اس تعاون کو وراثت کا بدل سمجھ کر اسے وراثت سے محروم کرنے کا جذبہ نہ ہو۔
- بیک وقت تعاون کی استطاعت نہ ہو تو مختلف اوقات میں تعاون کر دیا جائے۔

بچی کو گھریلو اشیائے ضرورت کی ضرورت نہ ہو اور والدین صاحب استطاعت ہوں اور وہ بچی کو تحفہ دینا چاہتے ہوں تو داماد کی مالی پوزیشن کے مطابق اس کو ایسا تحفہ دیں جس سے اس کا مستقبل بہتر ہو سکے، مثلاً: اس کے پاس سرمائے کی کمی ہے جس کی وجہ سے وہ کاروباری مشکلات کا شکار ہے، اس کو نقد رقم کی صورت میں ہدیہ دے دیا جائے تاکہ وہ اپنا کاروبار بہتر کر سکے، یا اس کو پلاٹ دے دیا جائے تاکہ وہ آہستہ آہستہ اپنا مکان بنا سکے، اگر اس کے پاس مکان نہیں ہے یا وہ مشترکہ خاندان میں رہائش پذیر ہے اور وہاں جگہ کی تنگی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں یہ پلاٹ یا گھر کی تعمیر، یا کاروبار میں مالی تعاون میاں بیوی (بچی اور داماد) کے لیے ایسا بہترین تحفہ ہے جو صرف انھی کے نہیں بلکہ آئندہ نسل کے بھی کام آئے گا۔ نیز یہ تعاون کی ایسی صورت ہے جس میں رسم، نمود و نمائش یا بلا ضرورت زیر بار ہونے کی کارفرمائی نہیں بلکہ خیر خواہی اور تعاون کا صحیح جذبہ ہے جو عنداللہ نہایت پسندیدہ ہے۔

> یہ جہیز نہیں بلکہ صلہ رحمی، تعاون اور خیر خواہی ہے

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اس صورت کو جہیز نہیں کہنا چاہیے بلکہ یہ تعاون اور صلہ رحمی یا ہدیہ ہے۔ جہیز کا کوئی تصور اسلام میں نہیں ہے۔ احادیث میں اس مروجہ جہیز کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی متعدد ازواج مطہرات میں سے کوئی بھی اپنے ساتھ جہیز لے



کرنہیں آئی، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنی چار بیٹیوں میں سے کسی ایک کو بھی، قبل از نبوت اور بعد از نبوت، جہیز نہیں دیا۔ صرف سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بابت مشہور ہے کہ آپ نے ان کو تین چار چیزیں بطور جہیز دی تھیں۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، اس کا کوئی تعلق مروجہ رسم جہیز سے نہیں ہے، اس کی وضاحت ابھی ہم کریں گے۔

عربی زبان میں تجہیز (جہیز بنانے) کا مفہوم

جہیز، عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ جَهَاز (سامان) ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے ﴿فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ﴾ ''جب (یوسف علیہ السلام کے کارندوں نے) برادران یوسف کا (واپسی کا) سامان (سفر) تیار کردیا۔'' (یوسف 12:70) جَهَّزَ (باب تفعیل) کے معنی ہوں گے: اس نے سامان تیار کیا۔ ہر موقع کے لیے الگ الگ سامان ہوتا ہے، اس کے حساب سے اس کے ساتھ یہ لفظ لگ کر اپنا مفہوم ادا کرتا ہے۔ جیسے جَهَاز العروس (دلہن کو تیار کرنا) جَهَاز الميت (میت کا سامان تیار کرنا) جَهَازالسفر (سفر کا سامان تیار کرنا) جَهَاز الغازی (غازی کو سامان، اسلحہ وغیرہ دینا)۔

احادیث میں یہ لفظ دو موقعوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ایک غازی کے لیے، اس کو میدان کارزار میں کام آنے والی اشیاء (خود، زرہ، اسلحہ وغیرہ) مہیا کرکے تیار کرنا۔ دوسرا، دلہن کو شب زفاف کے لیے تیار کرکے، یعنی اس کو عمدہ لباس وغیرہ سے آراستہ کرکے دولھا کے پاس بھیجنا۔ چنانچہ احادیث میں تین خواتین کا ذکر اس ضمن میں ملتا ہے۔ ایک سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کا، دوسرا سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا اور تیسرا سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا۔

① جنگ خیبر میں واپسی پر رسول اللہ ﷺ نے سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کو آزاد کرکے ان سے نکاح کرلیا تھا، اس حدیث میں آتا ہے:

«جَهَّزَتْهَا لَهُ أُمُّ سُلَيْمٍ فَأَهْدَتْهَا لَهُ مِنَ اللَّيْلِ» ''سیدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے سیدہ صفیہ کو تیار کیا اور ان کو شب باشی کے لیے نبی ﷺ کی خدمت میں پیش کردیا۔'' (صحيح البخاري:371)

② نجاشی (شاہ حبشہ) کی طرف سے سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو، ان کا نکاح بذریعہ وکالت نبی ﷺ کے ساتھ کرکے، نبی ﷺ کی خدمت میں ایک صحابی سیدنا شرحبیل بن حسنہ کے ساتھ روانہ کیا گیا تھا۔ اس حدیث میں آتا ہے: «ثُمَّ جَهَّزَهَا مِنْ عِنْدِهِ وَبَعَثَ بِهَا إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَجَهَازُهَا كُلُّ مِنْ عِنْدَ النَّجَاشِيِّ» ''پھر نجاشی نے سیدہ ام حبیبہ کو اپنے پاس سے تیار کیا اور ان کو رسول اللہ ﷺ کی طرف بھیج دیا..... اور ان کی ساری تیاری نجاشی کی طرف سے تھی۔'' (مسند أحمد: 427/6)

ان دونوں احادیث میں تجہیز، دلہن سازی، یعنی دلہن کو عروسی لباس اور آرائش و زیبائش سے آراستہ کرنے کے معنی میں ہے۔ اثاث البیت گھریلو سامان دینے کے معنی میں نہیں ہے جس کو آج کل جہیز کا نام دے دیا گیا ہے، حالانکہ ان احادیث میں جہیز کا لفظ ان معنوں میں ہرگز استعمال نہیں ہوا ہے۔ مسند احمد میں مزید جَهَاز کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا مطلب یہاں حق مہر کی ادائیگی ہے جو کہ سامان آرائش وزیبائش کے علاوہ مکمل طور پر نجاشی ہی کی طرف سے ادا کیا گیا تھا، اس لیے جَهَازُهَا كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ کہا گیا ہے۔

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا جہیز؟

③ رہا تیسرا واقعہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے جہیز کا جس سے جہیز کے جواز پر استدلال کیا جاتا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟

اس واقعے پر غور وخوض کرنے اور اس سے متعلقہ روایات کے مختلف طرق کا جائزہ لینے

دعائے مغفرت کی اپیل

مولانا محی الدین لکھوی رحمہ اللہ کی اہلیہ 27 مارچ کو وفات پاگئی تھیں۔ ان کی بخشش اور بلندیٔ درجات کی دعا کی اپیل ہے۔

دعائے صحت کی اپیل

دارالسلام کے خطاط اکرام الحق صاحب گزشتہ کئی ماہ سے صاحبِ فراش ہیں۔ قارئین کرام اور ان کے تلامذہ سے دعائے صحت کی اپیل ہے۔

رابطہ: نعیم اکرام (بیٹا)

0345-4745488



سے یہی بات واضح ہوتی ہے کہ اس کا تعلق بھی اثاث البیت سے نہیں ہے بلکہ یہ بھی دراصل دلہن کو پہلی مرتبہ دولھا کے پاس بھیجنے ہی کی تیاری تھی اور اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے سیدہ فاطمہ کو جو چیزیں دی تھیں، ان کا تعلق رات کو سونے کے لیے کام آنے والی چیزوں سے تھا، جیسے چادر، تکیہ، پانی کی مشک۔ جیسے سنن نسائی میں ہے:

«جَهَّزَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَاطِمَةَ فِي خَمِيلٍ وَّ قِرْبَةٍ وَ وِسَادَةٍ حَشْوُهَا إِذْخِرٌ» ''رسول اللہ ﷺ نے پہلے پہل سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجنے کے لیے سیدہ فاطمہ کو تیار کیا ایک چادر، مشک اور تکیہ کے ساتھ جس میں اذخر گھاس بھری ہوئی تھی۔'' (سنن النسائي: 3386)

اس روایت میں جَهَّزَ اور جَهَاز کے معنی وہی ہیں جو اس سے پہلے سیدہ صفیہ اور سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہما والی دونوں حدیثوں میں اس لفظ کے گزرے ہیں، یعنی دلہن کو شب زفاف کے لیے تیار کر کے دولھا کے پاس پہنچانا، چنانچہ سیدہ صفیہ سے متعلقہ روایت، جس میں آتا ہے کہ «جَهَّزَتْهَا أُمُّ سُلَيْمٍ فَأَهْدَتْهَا إِلَيْهِ مِنَ اللَّيْلِ» (ان کو سیدہ ام سلیم نے تیار کر کے (دلہن بنا کر) شب باشی کے لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا) امام نسائی بَابُ الْبِنَاءِ فِي السَّفَرِ میں لائے ہیں۔ بناء کا لفظ شب زفاف ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ امام نسائی کی اس تبویب اور اس کے تحت جَهَّزَتْهَا والی روایت درج کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ جَهَّزَ کے معنی دلہن سازی کے ہیں نہ کہ سامان جہیز کے۔

ہماری بیان کردہ وضاحت کی ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے متعلقہ روایت سنن ابن ماجہ میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سیدنا علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما کے پاس تشریف لے گئے اور وہ دونوں ایک چادر (خمیل) میں تھے۔ «قَدْ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ جَهَّزَهُمَا بِهَا، وَوِسَادَةٍ مَحْشُوَّةٍ إِذْخِرًا وَقِرْبَةٍ» ''اس چادر کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو تیار کیا تھا اور ایک تکیہ، اذخر گھاس کا بھرا ہوا، اور ایک مشک بھی عنایت کی تھی۔''

امام ابن ماجہ نے اس روایت کو بَابُ ضِجَاعِ آلِ مُحَمَّدٍ ﷺ کے تحت بیان کیا ہے، یعنی آل محمد (ﷺ کے گھرانے) کا بستر۔

امام ابن ماجہ کی اس تبویب سے بھی واضح ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے متعلقہ روایت میں جہیز کے معنی شب باشی کے سامان یا شب باشی کے لیے تیار کرنا ہیں نہ کہ مروجہ سامان جہیز کے۔

احادیث میں ان تین واقعات کے علاوہ (سوائے حدیثِ جہاد مَنْ جَهَّزَ غَازِيًا کے) تجہیز کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے، بالخصوص شادی بیاہ کے مسائل میں۔ اور ان تینوں واقعات میں جس سیاق میں یہ لفظ آیا ہے، اس کا وہی مفہوم ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ اس سے مروجہ جہیز مراد لینا یکسر بے جواز اور خلاف واقعہ ہے۔ بنا بریں پورے یقین اور قطعیت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مروجہ جہیز کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ستم ظریفی کی انتہا

اور یہ تو ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ لڑکی والوں سے اپنی پسند اور خواہش کے مطابق جہیز کا مطالبہ کیا جائے، حالانکہ لڑکی کے ماں باپ کا یہ احسان کیا کم ہے کہ وہ بچی کو ناز و نعمت میں پال کے اور اسے تعلیم و تربیت سے آراستہ کر کے اللہ کے حکم کی وجہ سے اپنے دل کے ٹکڑے کو دوسروں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اس احسان مندی کے بجائے ان سے مطالبات کے ذریعے سے احسان فراموشی کا اظہار کیا جاتا ہے جبکہ اللہ کا حکم احسان کے بدلے احسان کرنے کا ہے۔ ﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ﴾ نہ کہ محسن کے لیے عرصۂ حیات تنگ کرنے کا یا بھاری بھرکم جہیز نہ لانے پر لڑکی کا جینا دو بھر کر دینے کا حتی کہ اس کو خودکشی پر مجبور کیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے مرد کو قوّام (عورت کا محافظ، نگران اور بالا دست) بنایا ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ عورت کی مالی ضروریات پوری کرتا ہے، مرد اپنے اس مقام و مرتبہ کو فراموش کر کے عورت سے لینے کا مطالبہ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے سبب فضیلت ﴿وَ بِمَا اَنْفَقُوا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾ معاشی و مالی کفالت کی ذمے داری کے بھی خلاف ہے اور اس کے شیوہ مردانگی کے بھی منافی۔ بہر حال جس حیثیت سے بھی اس رسم کو دیکھا جائے، اس کی شناعت و قباحت واضح ہوجاتی ہے۔

رزقِ حلال ہی کیوں؟

خطاب: الشیخ عبداللہ ناصر رحمانی حفظہ اللہ
اعداد: حافظ شبیر صدیق، ریسرچ فیلو دارالسلام



رزقِ حرام کا تیسرا حملہ

رزق حرام کا تیسرا نقصان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رزق حرام کی شکل میں انسان کی نیکیاں قبول نہیں کرتا۔ رزق حرام کا دانہ پیٹ میں چلا جائے، اس کے اعمال برباد، نیکیاں برباد، اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا۔ فرمایا کہ ﴿اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ ''اللہ تعالیٰ تو متقین کی نیکیاں قبول کرتا ہے۔'' (المآئدۃ 27:5) اور تقوی، اصل تقویٰ کی جو بنیاد ہے وہ رزقِ حلال پر قائم ہے۔ اصل متقی وہ ہے جو حرام سے بچے، حرام مال سے بچے، حرام معیشت سے بچے۔ امام یحییٰ بن معین اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے:

الْمَالُ يَذْهَبُ حِلُّهُ وَحَرَامُهُ
يَوْمًا وَيَبْقٰى فِي غَدٍ آثَامُهُ
لَيْسَ التَّقِيُّ بِمُتَّقٍ لِإِلٰهِهِ
حَتّٰى يَطِيْبَ شَرَابُهُ وَ طَعَامُهُ
وَيَطِيْبَ مَا يَحْوِي وَيَكْسِبُ كَفُّهُ
وَيَكُوْنُ فِي حُسْنِ الْحَدِيْثِ كَلَامُهُ
نَطَقَ النَّبِيُّ لَنَا بِهِ عَنْ رَبِّهِ
فَعَلَى النَّبِيِّ صَلَاتُهُ وَسَلَامُهُ

فرماتے ہیں کہ ''مال چلا جائے گا حلال کا ہو یا حرام کا اور اے بندے! کل تیرے گناہ باقی رہ جائیں گے۔ جس مال کی خاطر تو قلابازیاں کھا رہا ہے، پسینے بہا رہا ہے، ختم ہو جائے گا اور کل صرف تیرے گناہ باقی رہ جائیں گے۔ فرماتے ہیں کہ

لَيْسَ التَّقِيُّ بِمُتَّقٍ لِإِلٰهِهِ

متقی وہ نہیں جو دعویٰ کرے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں، (اور صرف زبانی کلامی یہ کہتا پھرے کہ) اللہ بڑا بادشاہ ہے۔

حَتّٰى يَطِيبَ شَرَابُهُ وَطَعَامُهُ

متقی تو وہ ہے جس کا کھانا بھی حلال کا ہو اور پینا بھی حلال کا ہو۔

وَيَطِيبَ مَا يَحْوِي وَيَكْسِبُ كَفُّهُ

جو مال اس کے پاس جمع ہے وہ بھی حلال کا ہو اور اس کے ہاتھ جو مال کماتے ہیں وہ بھی حلال کا ہو۔

وَيَكُونُ فِي حُسْنِ الْحَدِيثِ كَلَامُهُ

اور گفتگو بھی اخلاق سے کرے، بدخلق متقی نہیں ہوسکتا۔ فرماتے ہیں کہ یہ باتیں میری نہیں ہیں، ایک محدث کا قول ہے کہ یہ باتیں میری نہیں ہیں۔



نَطَقَ النَّبِيُّ لَنَا بِهِ عَن رَبِّهِ

جو کچھ آپ کو بتا رہا ہوں یہ اللہ کے نبی نے اپنے پروردگار سے بیان کیا ہے۔

فَعَلَى النَّبِيِّ صَلَاتُهُ وَ سَلَامُهُ

اللہ ہماری طرف سے اپنے پیغمبر پر لاکھوں کروڑوں درود وسلام قبول فرمائے۔

(شعب الإيمان:518/7)

رزق حرام کی زد میں آپ کے عمل بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے عمل قبول نہیں کرے گا۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث کا معنی یہ ہے، اس حدیث کے بہت سے شواہد ہیں، بہت سے متون ہیں اور استدلال کے قابل ہیں یہ متون ۔ اللہ کے پیغمبر کا فرمان ہے کہ ایک شخص اگر چالیس درہم کا اور ایک روایت میں ہے دس درہم کا کپڑا خریدتا ہے اور اس میں ایک درہم حرام کا شامل ہو جائے، نو درہم حلال کے ہیں ایک درہم حرام کا شامل ہو جائے تو اللہ رب العزت اس کے ایک بار کپڑے پہننے سے چالیس دن تک اس کی کوئی نیکی قبول نہیں کرے گا۔(مسند أحمد: 98/2) اس کی نمازیں، سجدے، سب رائیگاں جائیں گے، یعنی آپ کے عمل قبول نہیں ہوں گے رزق حرام کی آمیزش کی وجہ سے۔ تو یہاں تو نو درہم حلال کے ایک درہم حرام کا ہے۔ حلال وحرام کی آمیزش ہے اور غلبہ بھی حلال کو ہے۔ لیکن جس کا سرمایہ ٹوٹل حرام کا ہو، جس کی معیشت کی بنیاد ہی حرام ہو، اس کا کیا انجام ہوگا؟ غور کیجیے!

رزقِ حرام کا چوتھا حملہ

اس دنیا میں مجھ جیسے گناہ گار کے لیے سب سے بڑا سہارا دعا اور توبہ کا سہارا ہے۔ لیکن ہماری یہ دعائیں، یہ ہماری توبہ، یہ ہمارے استغفار یہ بھی رزق حرام کی زد میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ دعائیں قبول نہیں کرتا۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «اَلدُّعَاءُ سِلَاحُ الْمُؤْمِنِ» ''دعا مومن کا ہتھیار ہے۔'' (مسند أبي يعلىٰ: 1/ 344) یہ سب سے بڑا ہتھیار جو ہے وہ دعا ہے۔ جو آپ کے ایٹمی ہتھیار ہیں ان سے بڑا ہتھیار دعا ہے۔ براہِ راست آپ اپنے خالق سے مخاطب ہوتے ہیں۔ جناب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ آدھی دنیا کے فاتح جب کسی مہم کو شروع کرتے، لشکر کشی فرماتے، قافلہ بھیجتے، ارادہ فرما لیتے تو بھیجنے سے پہلے غور کرتے کہ اس مشن کے لیے کما حقہ دعا میں نے کی یا نہیں کی۔ دعا کا حق ادا ہوا یا نہیں ہوا، اگر دل مطمئن ہوتا کہ ہاں خوب دعائیں کی اللہ تعالیٰ سے، پھر اس مہم کو روانہ کرتے ورنہ پھر دعا کرنے بیٹھ جاتے۔ آدھی دنیا کے فاتح۔ اور اگر دعائیں قبول ہی نہ ہوں، دعائیں قبول نہ ہونے کی سب سے بنیادی وجہ رزق حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «رَجُلٌ يُطِيلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيهِ وَيَقُولُ: يَا رَبِّ، يَا رَبِّ وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ غُذِيَ بِالْحَرَامِ فَأَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ؟»(صحيح مسلم:1015)

ایک شخص لمبا سفر کر کے جاتا ہے۔ اس لمبے سفر سے مراد سفر حج ہے۔ اب حج جیسی عبادت کتنی پاکیزہ عبادت، لمبا سفر کر کے جاتا ہے۔ «اَشْعَثَ اَغْبَرَ» اس کا سر خاک آلود ہے اور پاؤں گرد و غبار سے اٹے پڑے ہیں۔ یہ پوزیشن حج کے موقع پر عرفہ کے میدان میں ہوتی ہے۔ گرد و غبار سے بھرا پڑا ہے، کھلے آسمان کے نیچے احرام کی دو چادریں باندھے بیٹھا ہے۔ کھڑا ہوا دعائیں کر رہا ہے «يَمُدُّ يَدَيهِ» اپنے دونوں ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعائیں کر رہا ہے۔ «وَيَقُولُ: يَا رَبِّ! يَا رَبِّ!» اور دعاؤں میں ''یا رب'' کہہ رہا ہے، یا رب! یارب! بتاؤ کوئی رکاوٹ ہے استجابت کی یہاں پر؟ یعنی خود سفر حج مقدس سفر ہے۔ ایک ہے سفر، ایک ہے سفر حج۔ دونوں میں فرق ہے لیکن حج کا سفر نہ بھی ہو عام سفر ہو، تجارت کا ہو، کوئی بھی سفر ہو، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «ثَلَاثُ دَعَوَاتٍ مُسْتَجَابَاتٌ» تین دعائیں قبول ہیں۔ تین دعائیں اللہ قبول کر لیتا ہے۔ «دَعْوَةُ الْمُسَافِرِ وَدَعْوَةُ الْمَظْلُومِ وَدَعْوَةُ الْوَالِدِ لِوَلَدِهِ» ''ایک مسافر کی دعا، ایک مظلوم کی دعا، دوسرا باپ کی دعا بیٹے کے حق میں اللہ قبول کر لیتا ہے۔'' (سنن أبي داود : 1538، و سنن ابن ماجه: 3862) یعنی مسافر کی دعا بھی قابلِ قبول ہے اور یہ سفر تو حج کا ہے۔ یہ سفر نہیں بلکہ سفرِ حج ہے۔ فرض ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «مَنْ حَجَّ هَذَا الْبَيْتَ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَومِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ» ''جو شخص بیت اللہ کا حج کرے اور فسق و فجور نہ کرے، کسی گناہ کا ارتکاب نہ کرے، گالی گلوچ نہ دے اور اس کا سفر بالکل شریعت کے مطابق ہو، اس کا حج اللہ کے پیغمبر کے طریقے کے مطابق ہو، فرمایا کہ وہ حج کر کے یوں



لوٹے گا گناہوں سے پاک صاف ہو کر جیسے اس کی والدہ نے اس کو آج ہی پیدا کیا ہو۔'' (صحيح البخاري: 1820) استجابت، پھر کہاں کھڑا ہے؟ عرفہ کے میدان میں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «يَضَعُ الشَّيْطَانُ التُّرَابَ عَلَى رَأْسِهِ يَدْعُو بِالْوَيْلِ وَالثُّبُورِ» عرفہ کے میدان میں تو شیطان اپنے سر پہ خاک ڈالتا ہے اور کہتا ہے: میں مارا گیا، مجھے موت آ جائے۔ شیطان کہتا ہے مجھے موت آ جائے مر جاؤں میں۔ میں نے فلاں بندے پر چالیس سال لگائے، فلاں بندے پر ساٹھ سال لگائے، فلان بندے پر پچاس سال محنت کی۔ اس نے ایک ہی بار اللہ کو کہہ کر اپنے گناہوں کو بخشوا لیا، اللہ نے گناہوں کو معاف کر دیا۔ میری محنتیں برباد ہو گئیں، مجھے موت آ جائے۔ (اخبار مكة للفاكهي: 15/5) عرفہ کا میدان ہے، جہاں اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے بیچ عرفہ والوں کو سامنے رکھ کر فخر کرتا ہے کہ دیکھو میرے بندوں کو کس طرح عبادت کر رہے ہیں، کس طرح دعائیں کر رہے ہیں۔ استجابت کی صورتیں آپ دیکھیں: «أَشْعَثَ أَغْبَرَ» یہ خاک آلود جو کیفیت اور حالت ہے، سر خاک آلود، پاؤں خاک آلود، اللہ کو بڑی پسند ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے جب بارش کی دعا کرنی ہوتی بکھرے بالوں کے ساتھ، بوسیدہ کپڑوں کے ساتھ جنگل میں نکل جایا کرتے۔ شہری بستی کو چھوڑ کر جنگلوں اور میدانوں کا رخ کرتے تھے، بکھرے ہوئے بال لے کر جاتے تھے۔ بوسیدہ کپڑے اور پھٹا پرانا لباس لے کر جاتے تھے۔ ایسے ہی رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «رُبَّ أَشْعَثَ أَغْبَرَ مَدْفُوعٍ بِالْأَبْوَابِ ذِي طِمْرَيْنِ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ» کچھ ایسے بندے ہیں جن کے سر خاک آلود، کپڑے خاک آلود اور «ذِي طِمْرَيْنِ» دو بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ ایک اوپر اوڑھے ہوئے ہے ایک نیچے باندھے ہوئے ہے۔ «مَدْفُوعٍ بِالْأَبْوَابِ» جس کی ظاہری کیفیت کی بنا پر دروازوں پر دھکے دے کر نکال دیا جاتا ہے کہ اندر نہیں جاؤ سیٹھ صاحب ناراض ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کیا قیمت ہے؟ «لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ» جب یہ اللہ پر قسم کھا لے کہ یا اللہ ایسا ہو گا، یا اللہ ایسا کر! تو اللہ تعالیٰ ایسا کر دے۔ (صحيح مسلم: 2854، و مستدرك للحاكم: 364/4) اللہ تعالیٰ کو ایسے بندے پسند ہیں اور یہ «أَشْعَثَ أَغْبَرَ» خاک آلود ہیئت کے ساتھ اللہ کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ کیسی کیسی استجابت کی صورتیں ہیں۔ «يَمُدُّ يَدَيْهِ» اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے کھڑا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: « إِنَّ اللّٰهَ حَيِيٌّ كَرِيمٌ» ''اللہ بڑا باحیا ہے۔'' «يَسْتَحْيِي إِذَا مَدَّ الْعَبْدُ يَدَيْهِ إِلَيْهِ أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا» ''جب بندہ اپنے ہاتھوں کو اللہ کے سامنے پھیلا دے تو اللہ کو شرم آتی ہے کہ ان ہاتھوں کو خالی لوٹائے۔ (سنن أبي داود: 1490) استجابت کی کیسی کیسی صورتیں موجود ہیں۔ «يَقُولُ: يَا رَبِّ! يَا رَبِّ!» ''یا رب! یا رب! کہہ کر پکار رہا ہے۔'' ایک روایت میں نے پڑھی، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «إِذَا قَالَ الْعَبْدُ: يَا رَبِّ! أَرْبَعَ مَرَّاتٍ، يَقُولُ اللّٰهُ: لَبَّيْكَ يَا عَبْدِي سَلْ تُعْطَ» ''جب بندہ اپنی دعا میں چار دفعہ کہہ دے: یا رب! چار دفعہ تو اللہ فرماتا ہے: «لَبَّيْكَ» ''میں حاضر ہوں میرے بندے۔'' «سَلْ» ''مانگ'' «تُعْطَ» ''تجھے دیا جائے گا۔'' (مسند البزار: 130/18) ایک محدث نے اس حدیث کے تحت لکھا ہے کہ یہ قرآن کی ایک آیت سے ماخوذ ہے۔ سورۂ آل عمران کی جو آخری آیات ہیں ان میں چار دفعہ ربنا! کا تکرار ہے: ﴿رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعنَا مُنَادِيًا﴾ اس طرح ان میں چار دفعہ ''رب'' کی تکرار ہے۔ اور شاید یہ اسی مقام سے ماخوذ ہو، تو دیکھیں استجابت کی کیا کیا صورتیں جمع ہیں۔ یہ سب کچھ ہو گیا، اب نتیجہ کیا ہے؟ وہ دعائیں کر رہا ہے، یا رب ! یا رب! کہہ رہا ہے۔ سر خاک آلود، عرفہ کے میدان میں کھڑا ہے، لمبا سفر طے کر کے گیا ہے، سفر حج کی طوالت کا تو کوئی اندازا ہی نہیں۔ معارف التنزیل میں ہے محمد ابن یاسین ایک محدث بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک اور بزرگ تھے، سوچا چلو تعارف ہو جائے، حج کی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ یہ ملتقیٰ ہے، یہاں ملاقاتیں ہوتی ہیں، تعارف ہوتے ہیں۔ تعارف کے لیے دونوں میں اثنائے طواف بات چیت ہوئی۔ تو پھر پوچھا: یہاں کب پہنچے؟ گھر سے کب نکلے؟ اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ محمد ابن یاسین نے اپنا بتایا کہ مجھے گھر سے نکلنے میں اور بیت اللہ تک پہنچنے میں پانچ سال لگ گئے ہیں۔ دیکھیے کتنا لمبا سفر



ہے۔ بابا جی سے پوچھا: آپ بتایئے۔ فرماتے ہیں کہ گھر سے نکلا تھا داڑھی کالی تھی اب تمھارے سامنے پوری سفید ہو چکی ہے۔ «يُطِيلُ السَّفَرَ» ''لمبا سفر۔'' مسافر کی دعا قبول اور یہ سفر حج ہے، عرفہ کے میدان میں کھڑا ہے۔ خاک آلود ہیئت ہے، پھٹے پرانے کپڑے ہیں، احرام کی دو چادریں ہیں۔ ہاتھ پھیلائے ہوئے ہے، یارب! یارب! کہہ رہا ہے۔ استجابت کی ساری صورتیں جمع ہیں۔ اب دعا قبول نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن فرشتوں کی طرف سے کیا جواب ملتا ہے؟ یا اللہ کیا فرماتا ہے؟ فرماتا ہے کہ «مَطْعَمُهُ حَرَامٌ» ''اس کا کھانا حرام کا۔'' «مَشْرَبُهُ حَرَامٌ» ''اس کا پینا حرام کا۔'' «وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ» ''اس کا پہننا حرام کا۔'' «وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ» ''اور یہ حرام کی خوراک دیا گیا۔'' حرام اس کی غذا تھی۔ «فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لِذَالِكَ» اس کی دعا کہاں قبول ہو گی؟ بتایئے قبولیتِ دعا میں کون سی رکاوٹ ہے؟ صورتیں ساری جمع ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ دعائیں قبول کرتا ہے۔ لیکن یہاں قبول نہیں ہو رہیں۔ صرف ایک ہی وجہ نے تمام صورتوں کو ملیا میٹ کر دیا اور وہ کیا ہے؟ رزقِ حرام۔ کہ تیری روزی حرام کی ہے تیری دعائیں قبول نہیں ہوں گی۔ اس لیے دعائیں قبول نہیں ہو رہیں آج۔ ورنہ بیت اللہ کا اجتماع کوئی چھوٹا اجتماع نہیں ہوتا۔ لاکھوں مسلمان ہیں، لاکھوں کی تعداد ہوتی ہے اور دعائیں کر رہے ہیں کشمیر کی آزادی، فلسطین کی آزادی کے لیے لیکن دعائیں قبول نہیں ہو رہیں، اس لیے کہ عالمی معیشت ایک عجیب اور خطرناک جھنجٹ کے زیر سایہ ہے اور وہ ہے سود کی لعنت۔ سود اعلانِ جنگ ہے اللہ کے ساتھ ﴿فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ سود کھانے والو! تم سود نہیں کھا رہے اللہ کے ساتھ جنگ کر رہے ہو۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کیسے انتقام لیتا ہے۔ اس کا حملہ کیسا؟ اس کی پکڑ کیسی؟ ایک وزیر کا بیان آیا تھا کہ سودی معیشت کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا۔ اس سے چھٹکارے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ یہ گڑھی حبیب اللہ، جب مظفر آباد یا کشمیر کی طرف جاتے ہیں، یہ راستے میں ایک چھوٹا سا شہر آتا ہے، چونکہ یہاں آمد و رفت بہت ہوتی ہے تو وہاں سے گزرے، پوری بستی آباد ہے۔ اس بیان کے اگلے روز یا دو تین دن کے بعد وہاں سے گزر ہوا تو پوری بستی صاف ہو چکی تھی۔ ایسا سیلاب نے حملہ کیا۔ جس وزیر نے یہ بیان دیا انھی علاقوں کا تھا۔ پوری بستی ملیا میٹ ہو گئی۔ اللہ کے ساتھ جنگ کرنے والو! تمھاری اس میں خیر نہیں۔ تمھاری دعائیں اس لیے قبول نہیں ہو رہی ہیں۔ حج کا اجتماع کوئی چھوٹا اجتماع نہیں ہے۔ کچھ لوگ جمع ہو جائیں اور اللہ سے دعا کریں تو اللہ کو شرم آتی ہے کہ ان کے ہاتھ خالی لوٹائے۔ لیکن جہاں لاکھوں کی تعداد ہو، بہ یک آواز، بہ یک وقت دعائیں مانگنے میں مصروف ہوں، دعائیں قبول نہیں ہو رہیں، اس لیے کہ پنا جو ہے وہ حرام معیشت پر ہے یہ سودی لعنت جو ہے۔ نہ نیکیاں قبول ہو رہی ہیں، نہ توبہ قبول ہو رہی ہے اور نہ دعائیں قبول ہو رہی ہیں۔ ہمارے سہارے یہی تو ہیں۔ ہمارا سہارا عقیدہ ہے، ہمارا سہارا عمل ہے، مجھ جیسے گناہ گار کا سہارا دعا پر ہے۔ لیکن یہ قبول ہی نہیں ہو رہی کیونکہ معیشت کی اساس جو ہے وہ حرام ہے۔ یہ رزقِ حرام کی تباہ کاریاں ہیں ﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾ ''اللہ تعالیٰ تو متقین کی نیکیاں قبول کرتا ہے۔'' (المآئدۃ 27:5) اور تقویٰ کی اساس جو ہے وہ حلال معیشت پر ہے۔ اور اللہ متقین کے اعمال قبول فرماتا ہے۔ اس لیے بعض سلف کا قول ہے کہ اگر مجھے ایک بار معلوم ہو جائے کہ اللہ نے میرا ایک سجدہ قبول کر لیا، ایک سجدہ اللہ نے میرا قبول کر لیا ہے تو اس کے بعد موت آ جائے پروا نہیں خوشی ہو گی کیونکہ اللہ عبادت قبول کرتا ہے متقین کی۔ تو اللہ کا قبول کر لینا ایک سجدہ، یہ سند ہو گی کہ میں متقی ہوں۔ میں پرہیز گار ہوں۔ تو اعمال کی قبولیت میں بہت بڑی تاثیر جو ہے وہ انسان کی روزی کی ہے۔ یہ جو کچھ بتایا اس میں معاشرے کی اصلاح، معاشرے کی تطہیر، اچھے لوگو کا پیدا ہونا کہ میں جو دعا کروں، اللہ قبول کرے، جو دعا کروں اللہ قبول کرے۔ مستجاب الدعوات اللہ مجھے بنا دے۔ یہ سعد کی خواہش ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ معاملہ دعا کا نہیں ہے، ایک نسخہ ہے، ایک فارمولا ہے، تمھیں دیتا ہوں اس کو اپنا لو تم مستجاب الدعوات بن جاؤ گے۔ فرمایا کہ «أَطِبْ مَطْعَمَكَ تَكُنْ مُسْتَجَابُ الدَّعْوَةِ» ''روزی حلال کر لو، تمھاری معیشت حلال کی ہو جائے تو تم مستجاب الدعوات بن جاؤ گے۔'' (جامع العلوم والحکم: 5/12)



اس حدیث کا ایک راوی کہتا ہے کہ میں نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اللہ کے پیغمبر کے اس فرمان کے بعد تمھاری کیا کیفیت رہی؟ تو فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میری حالت یہ تھی ، کیفیت یہ تھی کہ جو لقمہ اپنے پیٹ میں داخل کرتا مجھے معلوم ہوتا کہ یہ لقمہ کہاں سے آیا ہے۔ جب تک یہ معلوم نہ ہوتا میں اس لقمے کو کھاتا ہی نہیں تھا چاہے فاقوں مروں۔ فاقے برداشت کر لیتا لیکن جب تک اس لقمے کا مخرج مجھے معلوم نہ ہو جاتا اس وقت تک میں اسے کھاتا ہی نہیں تھا۔ ایک ایک لقمہ میں نے دیکھ کر حلال ذرائع سے کما کر کھایا، یہ میری حالت رہی، اللہ ہمیں بھی یہ توفیق عطا فرما دے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے میرے بھائیو! اصلاح عقیدہ، اصلاحِ عمل، اصلاحِ معاشرہ ان تمام چیزوں کی بنیاد جو ہے وہ انسان کی معیشت ہے۔ قبولِ اعمال، قبولِ توبہ، قبولِ دعا ان تمام چیزوں کی بنیاد جو ہے وہ انسان کی معیشت پر ہے، اس لیے معیشت حلال کی ہونی چاہیے۔ حرام معیشت انسان کو بالکل مفلوج کر دے گی۔ نہ اس کا عقیدہ قائم رہے گا نہ اس کا عمل قائم رہے گا۔ رزق حرام پیٹ میں ہے اللہ اس کی دعائیں قبول نہیں کرے گا، ایسا انسان کامیاب نہیں ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنْ حَرَامٍ» ''جو گوشت حرام کے پیسے سے بنتا اور بڑھتا ہے، حرام کھا کھا کر بنتا ہے وہ گوشت جنت میں داخل ہو ہی نہیں سکتا۔'' یعنی جب تک وہ گوشت انسان کے اوپر موجود ہے جنت میں داخل نہیں ہوسکتا۔ پھر کیا معاملہ ہوگا؟ اس کا اگر عقیدہ ٹھیک ہے تو اللہ تعالیٰ جہنم کی بھٹی میں ڈال کر اس گوشت کو جلائے گا۔ سال بھر جلائے، دو سال جلائے، دس سال جلائے، سو سال جلائے اللہ کی مرضی، جب وہ گوشت جل جائے گا تو پھر ممکن ہے وہ اچھے عقیدے کی بنا پر جنت کا مستحق بن جائے۔ فرمایا: «اللَّحْمُ الَّذِي نَبَتَ مِنْ حَرَامٍ فَالنَّارُ أَوْلَى بِهِ» ''جو گوشت رزق حرام سے بنتا ہے اس گوشت کی حق دار جو ہے وہ جہنم کی آگ ہے۔'' (شعب الإیمان: 56/5)

جنت ایسے گوشت کو قبول نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے لیے پوری جنت حلال کر دی، ایک درخت جو ہے شجرۂ ممنوعہ قرار دے دیا، اس درخت کے قریب نہیں جانا۔ نظارہ ہمارے سامنے موجود ہیں، پس ایک درخت اس کے قریب نہیں جانا، تو آدم و حوا نے ﴿ذَاقَا الشَّجَرَةَ﴾ اس درخت کے پھل کو کھایا نہیں بلکہ چکھا: ﴿بَدَتْ لَهُمَا سَوْاتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ﴾ ''اسی وقت برہنہ ہو گئے، جنت کے لباس اتار دیے گئے، پشیمان ہوئے، یا اللہ! توبہ کا موقع دے دے۔ فرمایا: دوں گا ضرور مگر جنت میں رہنے کے قابل نہیں ہو تم اب زمین پر چلے جاؤ، زمین پر جا کے توبہ کرو۔'' (الاعراف 22:7) یہ پہلا واقعہ بہت سے دروس کا حامل ہے۔ رزق حرام اور معیشت حرام کا انجام آپ دیکھ لیں کہ ایسے انسان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ کیونکہ اس کے عمل تو قبول ہوں گے ہی نہیں، اور جنت کا دخول عمل چاہتا ہے، جدوجہد چاہتا ہے اور یہاں سارے اعمال رائیگاں جا رہے ہیں، نہ نماز مقبول نہ روزہ مقبول نہ حج مقبول۔ عمل کی قبولیت جو ہے وہ رزقِ حلال ہے۔ فرمایا: ﴿يَاأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا﴾ ''اے انبیاء کی جماعت! پہلے حلال کھاؤ اس کے بعد نیک عمل کرو۔'' (المؤمنون 51:23)

ترتیب وار، اکلِ حلال پہلے اور عمل صالح بعد میں۔ معنی عمل صالح کی بنیاد جو ہے وہ اکلِ حلال ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ اللَّهَ أَمَرَ الْمُؤْمِنِينَ بِمَا أَمَرَ بِهِ الْمُرسَلِينَ» ''اللہ تعالیٰ نے مومنین کو وہی حکم دیا ہے جو انبیاء کو دیا ہے۔'' انبیاء سے کہا: ﴿كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ﴾ ''حلال کھاؤ۔'' (المؤمنون 51:23) اور مومنین سے بھی کہا: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ﴾ ''اے ایمان والو! حلال رزق کھاؤ۔'' (البقرة 172:2، و صحیح مسلم: 1015-(65))

حلال مال کھاؤ، حلال روزی کھاؤ، ایک ہی خطاب ہے انبیاء کو اور اہل ایمان کو بھی۔ اس کا معنی یہ کہ اس کے بغیر نجات کی صورت کوئی نہیں۔ چاہے وہ عام انسان ہو، اس کی نمازیں اور حج ہو اور چاہے وہ انبیاء کی جماعت ہو جن کی نیکیاں قوموں کے لیے، امتوں کے لیے آئیڈیل ہوتی ہیں۔ انبیاء کے لیے بھی ضروری ہے کہ تمھاری معیشت حلال کی ہو اور تمھارے عمل کی بنیاد رزقِ حلال پر ہو۔ (**جاری ہے**)

مشرقِ وسطیٰ

خطے کی حالیہ صورتِ حال کا جائزہ

محمد انیس الرحمن

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مشرق وسطیٰ کی صورتِ حال تیزی کے ساتھ بدل رہی ہے۔ ان حالات میں جبکہ روس نے شام کے ساحلی علاقے طرطوس سے اپنے بحری بیڑے کو بیروت کی بندرگاہ کی جانب حرکت دینا شروع کردی ہے، امریکی صدر اوباما اپنی دوسری مدت صدارت میں اپنے پہلے دورۂ اسرائیل کے لیے خطے میں پہنچ گئے اور اسرائیل کو امریکی حمایت کی پوری یقین دہانی کے بعد فلسطینی اتھارٹی اور خطے کے دیگر عرب ممالک کی خوب خبر لی۔ انھوں نے اپنے ایک خطاب میں کہا کہ امریکہ آزاد فلسطینی ریاست کی حمایت کرتا ہے اور اس کے استحکام کے لیے ہر طرح کی مدد کے لیے تیار ہے لیکن فلسطینی اتھارٹی ابھی تک اسرائیل کو مٹانے کے منصوبے پر عمل پیرا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے مقبوضہ فلسطین کی اسلامی تحریک حماس اور اس کے زیر اثر علاقے غزہ کے فلسطینی مسلمانوں کی سیاسی اور عسکری سرگرمیوں کے حوالے سے بھی تحفظات کا اظہار کیا۔ اس سارے معاملے میں اہم بات یہ ہے کہ جس وقت اوباما اسرائیل کا دورہ کر رہے تھے، اس وقت حماس کی جانب سے اسرائیل پر کئی میزائل داغے گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یک دم مغرب کے صہیونی صلیبی میڈیا میں ایک مرتبہ پھر حماس کے خلاف پروپیگنڈے کا طوفان مچا دیا گیا۔ بات صرف مغربی میڈیا تک محدود نہیں ہے بلکہ عالم عرب کا لبرل میڈیا بھی اس سلسلے میں پیش پیش ہے۔

ایک ایسے وقت میں جب شام میں اسد حکومت شامی حریت پسندوں کے ساتھ نبرد آزما ہے اور اپنے علاقائی اتحادیوں کی مدد سے حریت پسندوں کو کچلنے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہی ہے اردن کے شاہ عبداللہ کا بیان خاصا معنی خیز ہے کہ ''اسد حکومت کے دن گنے جا چکے۔'' انھی دنوں امریکی صدر اوباما اسرائیل کا دورہ کر رہے تھے۔ اس دوران میں سب سے اہم اور معنی خیز پیش رفت یہ ہوئی ہے کہ ترکی سے نبرد آزما کردوں کی ورکرز پارٹی کے لیڈر عبداللہ اوجلان نے ترکی کے خلاف اپنی جنگ بند کرنے کا اعلان کرتے ہوئے اپنے حریت پسندوں کو ترکی کا علاقہ چھوڑ دینے کا حکم دیا ہے۔ ان تمام حالات کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوگا کہ یہ تمام تبدیلیاں خطے میں کسی بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ ہمیں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنا ہوگی کہ مشرق وسطیٰ میں تبدیلی کا بڑا محور مقبوضہ فلسطین کی اسلامی تحریک حماس ہی ہوگی کیونکہ یہ تمام معاملات اسرائیل کے تحفظ اور اس کی مستقبل کی توسیع پسندی کے لیے عمل میں لائے جا رہے ہیں اور اس کا براہ راست مقابلہ حماس سے ہے۔



عالم عرب میں حماس خود کو موثر قیادت کے طور پر پیش کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ حماس کی اس مقبولیت نے اسرائیل کی ساکھ کو بری طرح تباہ کیا ہے۔ حماس کی سفارتی میدان میں کامیابیوں نے اسرائیل کا چہرہ ساری دنیا کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ، اسرائیل اور ان کی اتحادی قوتیں اس کوشش میں ہیں کہ حماس کا امیج پوری دنیا میں خراب کیا جائے۔ اس شر انگیزی میں مغربی طاقتیں بھی اسرائیلی قیادت کا پورا ساتھ دے رہی ہیں۔

لبرل نظریات رکھنے والوں کی زبانی حماس کو ایک غاصب، ظالم اور سخت گیر تنظیم کے طور پر متعارف کرایا جارہا ہے۔ اسی سلسلے میں وفا جمیل نامی ایک خاتون کی کہانی کو ذرائع ابلاغ میں بڑھا چڑھا کر بیان کیا جارہا ہے۔ وفا جمیل نکبہ (Nakba) سے تعلق رکھنے والی تیسری نسل کی فلسطینی پناہ گزین ہے۔ وہ 1975ء میں غزہ میں پیدا ہوئی تھی اور 1994ء میں وہ میڈیا کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بَرزیت (Birzeit) یونیورسٹی رملہ چلی گئی۔ وہ ایک دستاویزی فلم کی ڈائریکٹر کے طور پر کام کرتی ہے۔ 2008ء میں وفا نے تنظیم آزادیٔ فلسطین کے تحت ''حماس'' نامی فلم بنائی جس میں اُس نے حماس کو کھل کر تنقید کا نشانہ بنایا۔ اُس کے بعد سے وفا غزہ میں آنے سے خوفزدہ ہے اور اُس نے یہی واویلا بپا کر رکھا ہے کہ غزہ جانے پر میری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ عام طور پر غزہ کے شہریوں کی زندگی اوسط سے بہت زیادہ مشکل ہوگئی ہے، اس لیے کہ حماس نے بڑا اثر ورسوخ حاصل کر لیا ہے۔ میں نے اسلامی حجاب پہننے سے انکار کر دیا تھا اور حماس کے ہمدردوں نے میرے خاندان والوں کے گھر کی دیوار پر میرے متعلق برے الفاظ لکھنے شروع کر دیے۔ چنانچہ ہائی سکول کے زمانے ہی میں مجھے عوام میں اسکارف پہننے پر مجبور کیا گیا تھا۔ جیسے ہی فلسطینی اتھارٹی 1994ء میں غزہ میں داخل ہوئی میں نے ہیڈ اسکارف پہننا چھوڑ دیا۔ دراصل غزہ کے لوگوں کے لیے سب سے بڑی پریشانی اسرائیلی محاصرہ ہے۔ ناکہ بندی نے غزہ کی پٹی میں فلسطینیوں کو ان کے بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر دیا ہے۔ یہ محاصرہ ان کو ان کی مصنوعات کی درآمد اور برآمد اور ان کے اپنے ملک کے اندر اور باہر سفر کرنے سے روک دیتا ہے۔ یہ انھیں ان کی کاشتکاری زمین اور ماہی گیری کی جگہ تک رسائی سے روک دیتا ہے۔ ناکہ بندی ایک ایسی اجتماعی سزا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کے لیے خوراک کی محفوظ رسد، طبی دیکھ بھال، تعلیم، پینے کا پانی اور ثقافتی تبادلے وغیرہ ناممکن ہیں۔ یہ محاصرہ کلی طور پر عوام کو حماس کے قبضے میں کر دیتا ہے۔ ناکہ بندی ہی وہ بنیادی وجہ ہے کہ حماس اب تک اقتدار میں ہے۔ اسرائیل ٹینکوں، محافظوں سے لیس گاڑیوں، آلات حرب، گنوں سے لیس ہیلی کاپٹروں اور ایئر فورس کے ساتھ 7.5 ملین لوگوں کا ایک ملک ہے اور غزہ 1.7 ملین لوگوں کا ایک چھوٹا سا مقبوضہ علاقہ ہے جس کے پاس کوئی بھاری ہتھیار نہیں ہے۔ اور حقیقت میں غزہ کے عام شہریوں نے حماس کے بجائے ہمیشہ خود اسرائیلی حملے کی قیمت ادا کی۔ یہ تو تھی وفا کی کہانی جو کہ غزہ سے باہر زندگی گزار رہی ہے اور اُس پر امریکیوں اور اسرائیل کی لابی کے اثرات اتنے گہرے ہیں کہ وہ غزہ کے باسیوں پر بیتے جانے والے تمام مظالم کا ذمہ دار حماس کو ٹھہراتی ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔

وفا جمیل کے نظریات اُسی چارج شیٹ کا حصہ ہیں جو اسلام اور مسلمانوں پر انسانیت کے دشمنوں کی طرف سے لگائی گئی ہے۔ اس کے اہم نکات میں سے عدم رواداری، بنیاد پرستی، خواتین کی حقوق تلفی اور تاریک خیالی ہیں۔ یہ چارج شیٹ شاید تاریخ انسانی کی سب سے زیادہ جھوٹی اور خلافِ حقیقت چارج شیٹ کہی جاسکتی ہے۔ عملاً دنیا میں جو ہو رہا ہے وہ اس کے برعکس ہے۔ دنیا کی ظالم طاقتوں نے مل کر دنیا کے وسائل پر قبضہ اور انسانوں کو اپنا غلام بنانے کے لیے ایک پلان بنایا ہے اور اس پر وہ عمل پیرا ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دنیا میں چیلنج کرنے والی کوئی طاقت اور نظریہ باقی نہ رہے۔ فلسطین میں حماس کے مقابلے کے لیے ''الفتح'' کو نمایاں کیا جارہا ہے اور فرضی ناموں کے انٹرویو دکھا کر اسے رائے عامہ بتا کر پیش کیا جارہا ہے کہ عوام اب اکتا گئے ہیں اور وہ اب آزادی کی جنگ نہیں لڑنا چاہتے۔ ماضی میں امریکہ اور اسرائیل نے مل کر ڈیڑھ کروڑ ڈالر کا اسلحہ (اپریل 2007ء میں) الفتح کو بھجوایا تاکہ حماس کے مقابلے میں کمزور نہ پڑے۔

حماس پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ وہ غزہ کے ہسپتالوں کو ہیڈ کوارٹر یا جہادی سرگرمیوں کے



لیے استعمال کر رہی ہے۔ بعدازاں اس الزام کو اقوام متحدہ نے غلط قرار دے دیا جو کہ حماس کی حقانیت کا واضح ثبوت ہے۔اقوام متحدہ کے سماجی بہبود وتعمیرات کے ادارے ''انروا'' کے ڈائریکٹر جان گنگ کا اسرائیل کے ان الزامات کو مسترد کرتے ہوئے کہنا تھا کہ حماس (اسلامی تحریک مزاحمت) شفا ہسپتال کو اپنی قیادت کے ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال نہیں کر رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ حماس شفا ہسپتال کو ہسپتال کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ شفا ہسپتال میں 40 غیر ملکی ڈاکٹر میڈیکل ٹیم میں شامل ہوئے ہیں۔ گنگ نے مزید بتایا کہ غزہ کی پٹی کسی انسانی المیے سے دوچار ہوسکتی ہے کیونکہ 10 لاکھ فلسطینیوں تک پانی نہیں پہنچ رہا ہے۔ اسرائیلی فوجی حملے جاری ہیں اور ان حالات میں پانی کی پائپ لائنوں کی مرمت مکمل نہیں ہوئی۔ ڈائریکٹر نے بتایا کہ ''انروا'' کے سکولوں میں پناہ لینے والے مہاجرین کی تعداد 35 ہزار ہوچکی ہے۔

حماس پر یہ الزام بھی ہے کہ بعض ممالک اُسے فنڈز دیتے ہیں جن میں ایران کا نام لیا جاتا ہے۔ پروپیگنڈا مہم میں یہ کہا جارہا ہے کہ محمود عباس، الفتح، فلسطینی اتھارٹی اور حماس کو بیرونی ممالک سے امداد ملتی ہے جسے یہ لیڈر کھا پی کر برابر کر دیتے ہیں۔ ہر دو فلسطین کے عوام غربت، جہالت، بھوک اور بیماری سے دوچار رہتے ہیں اور خیرات وصدقات اور زکوٰۃ پر گزر بسر کرتے ہیں۔ ردعمل کے طور پر عوام مظاہرہ کرتے ہیں جنھیں فی الفور بے رحمی سے فلسطینی پیرا ملٹری فورسز دبا دیتی ہیں۔ ادھر حماس کی ناقابل فہم پالیسیوں کی وجہ سے فلسطینی کاز کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔

حماس کے لیڈروں پر مختلف دور میں مختلف الزامات لگتے رہے ہیں جن میں بانی رہنما بھی شامل ہیں مگر وقت نے تمام الزامات کو غلط ثابت کر دکھایا اور حماس کے رہنماؤں نے اپنی جانوں پر کھیل کر بھی آزادی کی تحریک سے ناتا نہیں توڑا۔ان میں سے نمایاں نام شیخ احمد یاسین کا ہے جو کہ حماس کے بانی رہنما تھے۔ شیخ احمد یاسین 1938ء میں پیدا ہوئے۔ اُس وقت فلسطین پر برطانیہ کی حکمرانی تھی۔ اس وقت سے ہی ان کے تمام نظریات اور تصورات اس توہین و ہزیمت پر استوار ہونے لگے جس کا فلسطینیوں کو شکست کے بعد سامنا تھا۔ بچپن میں ایک حادثے کے نتیجے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی اسلامی تعلیمات کے لیے وقف کر دی تھی۔ انھوں نے مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں تعلیم حاصل۔ قاہرہ اس وقت ''اخوان المسلمون'' کا مرکز تھا۔ یہ دنیائے عرب کی پہلی اسلامی سیاسی تحریک تھی۔ یہیں ان کا یہ عقیدہ راسخ ہوتا چلا گیا کہ فلسطین اسلامی سرزمین ہے اور کسی بھی عرب رہنما کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس کے کسی بھی حصہ سے دستبردار ہو۔اگرچہ فلسطینی انتظامیہ سمیت عرب رہنماؤں سے ان کے تعلقات استوار رہے، تاہم ان کا یہ راسخ عقیدہ تھا کہ ''نام نہاد امن کا راستہ امن نہیں ہے اور نہ ہی امن جہاد اور مزاحمت کا متبادل ہوسکتا ہے''۔

دبلے پتلے جسم کے مالک شیخ یاسین کی نظر بھی انتہائی کمزور تھی اور وہ انتہائی دھیمی آواز میں گفتگو کیا کرتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ان تمام فلسطینیوں کی امیدوں کا مرکز تھے جو اس تصور سے مایوس ہو چکے ہیں کہ امن ان کی زندگیوں میں کوئی تبدیلی لاسکتا ہے۔شیخ یاسین کو سب سے پہلے 1987ء میں عالمی شہرت ملی جب وہ انتفاضہ اول کے موقع پر سامنے آئے۔ اس وقت فلسطینی اسلامی تحریک نے ''حماس'' نام اختیار کیا جس کے معنی ''جوش و جذبہ'' کے ہیں اور شیخ یاسین اس کے روحانی قائد چنے گئے۔ 1989ء میں اسرائیلی فوج سے تعاون کرنے والے فلسطینیوں کے قتل کا حکم دینے کی پاداش میں اسرائیل نے انھیں عمر قید کی سزا سنائی تھی۔1997ء میں انھیں ان دو اسرائیلی ایجنٹوں کے بدلے رہا کر دیا گیا تھا جن پر اردن میں فلسطینی رہنماؤں کو قتل کرنے کا الزام تھا، تاہم اسیری کے ان دنوں میں ان کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا اور وہ فلسطین کی جہادی مزاحمت کی علامت بن گئے۔ وہ عقبہ (اردن) میں ہونے والی سربراہ ملاقات اور مذاکرات کے نتائج سے بھی مطمئن نہیں تھے۔

اس ملاقات میں امریکہ، اسرائیل اور فلسطینی رہنماؤں نے ایک دوسرے سے ملاقاتیں کی تھیں اور اس سربراہ کانفرنس کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں اس وقت کے فلسطینی وزیراعظم محمود عباس نے تشدد کو ختم کرنے کے عزم کا اظہار کیا تھا۔اسرائیل ان سے شدید نفرت کا اظہار کرتا رہا ہے بلکہ انھیں



فلسطینیوں کا اسامہ بن لادن قرار دیتا ہے۔ شیخ ستمبر 2003ء میں ایک قاتلانہ حملے میں زخمی ہوئے۔ تاہم 22 مارچ 2004ء کو اسرائیل کے ایک گن شپ ہیلی کاپٹر کے میزائل حملے میں شہید ہوگئے۔ اس وقت آپ نماز فجر کی ادائیگی کے لیے جارہے تھے۔ حملے میں ان کے دونوں محافظوں سمیت 10 دیگر افراد بھی جاں بحق اور شیخ یاسین کے دو صاحبزادوں سمیت 12 سے زائد افراد زخمی ہوئے۔ اقوام متحدہ کے اُس وقت کے معتمد عام کوفی عنان نے اسرائیل کے اس اقدام کی شدید مخالفت کی۔ اقوام متحدہ کے ہائی کمیشن برائے انسانی حقوق نے ان کے قتل کے خلاف قرارداد منظور کی جو چین، بھارت، انڈونیشیا، روس اور جنوبی افریقہ سمیت 31 ممالک کی حمایت سے منظور ہوئی۔ مخالفت میں دو رائے آئیں جبکہ 18 ارکان غیر حاضر رہے۔ عرب لیگ اور افریقی یونین نے بھی ان کے قتل کی مذمت کی۔ برطانیہ اور امریکہ کا ردعمل یہ رہا: ''اسرائیل کو اپنے تحفظ کا حق حاصل ہے لیکن وہ اس واقعے کی مذمت کرتے ہیں۔'' جبکہ عراق میں اس وقت کے امریکی سفیر جان نیگروپونٹے نے شیخ یاسین کو ایک ''دہشت گرد'' تنظیم کا سربراہ قرار دیا۔ اسرائیل کے اس وقت کے وزیر دفاع شاؤل موفاز نے انھیں ''فلسطینی بن لادن'' قرار دیا تھا جبکہ حزب اختلاف کے سربراہ شمعون پیریز کا کہنا تھا کہ وہ نہیں سمجھتے کہ فلسطینی رہنماؤں کو قتل کرنے سے دہشت گردی ختم کی جاسکتی ہے، یہ ایک غلط فیصلہ تھا۔ ان کے قتل پر فلسطینی اتھارٹی نے تین روزہ قومی سوگ کا اعلان کیا اور رملہ میں یاسر عرفات کی رہائش گاہ پر فلسطینی پرچم سرنگوں رہا۔ حماس کے رہنما اسماعیل ہانیہ نے کہا کہ ''شیخ یاسین اس وقت کے منتظر تھے کہ انھیں شہادت ملے۔ ایریل شیرون (اسرائیلی وزیر اعظم) نے اپنے لیے جہنم کا دروازہ کھول دیا ہے''۔ غزہ میں ان کی نماز جنازہ میں دو لاکھ افراد نے شرکت کی۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے شیخ یاسین کے قتل کی مذمت کے حوالے سے قرارداد پیش کی جسے امریکہ نے ویٹو کردیا۔ شیخ احمد یاسین کا مشہور قول یہ ہے: ہم نے اس راہ کا انتخاب کیا ہے جس کا اختتام فتح یا شہادت ہے۔ عبدالعزیز رنتیسی کو ان کی جگہ حماس کا قائد قرار دیا گیا جو 17 اپریل 2004ء کو اسرائیل کے دوسرے حملے میں شہید ہوئے۔

حالیہ دور میں فلسطین کو اقوام متحدہ میں غیر رکن مبصر ملک کا درجہ ملنے اور وسط نومبر میں اسرائیل کی غزہ کی پٹی پر 8 روزہ بے مقصد عسکری یلغار کے بعد امریکی انٹیلی جنس حلقوں میں اسلامی تحریک مزاحمت (حماس) کے مستقبل سے متعلق ایک نئی بحث جاری ہے۔ اسرائیلی جارحیت کے نتیجے میں حماس کی عوامی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کے برعکس امریکہ اور اسرائیل سے نسبتاً قریب سمجھی جانے والی صدر محمود عباس کی جماعت ''فتح'' سیاسی اور سفارتی محاذوں پر آگے آنے کے باوجود عوامی سطح پر پس منظر میں چلی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فتح کی مرکزی قیادت عوام سے سخت مایوس دکھائی دیتی ہے۔ امریکہ میں نیشنل ڈیفنس اکیڈمی سے وابستہ دفاعی تجزیہ نگار پروفیسر جارج فریڈمن نے اپنے تجزیاتی مضمون میں فلسطین میں حالیہ سفارتی اور دفاعی پیش رفت کے تناظر میں حماس کے مستقبل کا تجزیہ کیا ہے۔ ان کا یہ مضمون ''انٹرنیشنل اسٹرائفورڈ انٹیلی جنس'' کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔ مسٹر فریڈ من لکھتے ہیں: ''اسرائیل، حماس کی عوامی مقبولیت دبانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کرے گا لیکن خطے کے موجودہ حالات بالخصوص عرب انقلابات اور اس کے نتیجے میں اسلام پسند قوتوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد تل ابیب حماس کے بارے میں اپنی پالیسی میں کامیاب ہوتا دکھائی نہیں دیتا کیونکہ پڑوسی ملکوں میں دینی جماعتوں کی تقویت اور عوامی پذیرائی حماس کی عوامی مقبولیت میں اضافے کا باعث ضرور بنے گی۔''

یہ وہ حالات ہیں جب امریکی صدر اوباما نے اسرائیل کا دورہ کیا ہے، اس لیے عرب مبصرین کے علاوہ بعض عالمی تجزیہ نگاروں نے بھی اوباما کے اس دورے کو بے نتیجہ قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکی صدر اوباما کے دورہ اسرائیل سے حماس کی مقبولیت کو دبایا نہیں جاسکتا۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ اسرائیل کے دورے سے اسرائیل کو خطے میں سیاسی طور پر استحکام نصیب ہوگا تو یہ ان کی غلط فہمی ہے۔

کتاب

بہترین ہم نشین

23 اپریل ''عالمی یومِ کتاب'' کے سلسلے میں دلچسپ کاوش

محمد نعمان فاروقی
(ریسرچ فیلو دارالسلام)



جب کتاب کے ساتھ تعلق بڑھنے لگتا ہے تو بیوی ایسی کتاب کو اپنی سوتن سمجھنے لگتی ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتی ہے کہ میری جگہ کتاب لے رہی ہے۔ اسی طرح بعض بیویاں مطالعے کی بڑی شوقین ہوتی ہیں اور خاوند ان کے زیر مطالعہ کتابوں کو اپنا رقیب ہی سمجھتے ہیں۔ وہ لمحے کس قدر دلچسپ ہوتے ہیں جب بچے اپنے ابو جان کے آگے کھلی کتاب کو بند کر کے اپنی فرمائش پوری کرنے کی خواہش کرتے ہیں، جب اہلیہ کھانا تیار کر کے پہلے دھیمے لہجے میں بلاتی ہے کہ کھانا تیار ہوگیا ہے اور سرتاج کتاب میں غرق ہوتے ہیں، اتنے میں کھانا ٹھنڈا ہوجاتا ہے اور اہلیہ ذرا بلند آواز سے کہتی ہے: ''فلاں کے ابو! کھانا کھا لیں، نہیں تو کھانا.....'' مگر سرتاج صاحب کو مطالعے سے دلچسپی ہے، وہ کتاب سے نظر نہیں ہٹاتے اور بیگم صاحبہ کی ناراضی مول لے لیتے ہیں۔

دراصل دیگر مشغولیات کی طرح کتاب بینی بھی ایک شوق ہے اور اسی طرح کا ایک شوق محض کتابیں جمع کرنے کا بھی ہے۔ اس میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ انسان جمع شدہ کتب سے استفادہ کرے مگر ہر قسم کی کتابیں جمع کرتا رہتا ہے اور ان کے جدید و قدیم نسخے حاصل کرنے کا شوق رکھتا ہے۔ پھر کئی لوگوں کو یہ شوق بھی ہوتا ہے کہ وہ کتابوں کے متعلق معلومات رکھیں کہ کون سی کتاب، کس موضوع پر، کس مصنف کی تصنیف ہے اور اسے کس ادارے نے شائع کیا ہے، اسی طرح کئی لوگوں کو کتابیں فروخت کرنے کا شوق ہوتا ہے۔

کتاب کے ساتھ تعلق انسان کو تنہا نہیں رہنے دیتا۔ سفر میں بھی کتاب، انتظار گاہ میں بھی کتاب، گھر میں بھی کتاب، دکان، فیکٹری یا آفس میں بھی کتاب! کتاب ایک بہترین ساتھی ہے جو لوگوں کی زندگی کے تجربات و مشاہدات، علوم وفنون اور ادب و آداب اپنے اندر سمائے ہوتی ہے اور غیر محسوس انداز سے اصلاح کر دیتی ہے۔

الیکٹرانک میڈیا کے اس دور میں یہ بات بھی عجوبہ ہے کہ گوگل کے اندازے کے مطابق 2010ء میں مختلف موضوعات پر 13 کروڑ کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہوئیں۔ یہ امر اس بات کی دلیل ہے کہ جدید آلات کی ایجاد کے باوجود کتاب سے رابطہ منقطع نہیں ہوا۔

پرنٹنگ پریس کی ایجاد اور اسے اختیار کرنے سے پہلے تمام کتابیں ہاتھ سے تحریر کی جاتی تھیں جس سے کتابیں مہنگی اور نایاب تھیں۔ اس کے باوجود قرونِ وسطیٰ میں عالمِ اسلام کے اندر قرطبہ، بغداد، قاہرہ اور دمشق میں بڑے بڑے کتب خانے تھے حتی کہ اندلس میں خلیفہ الحکم ثانی (366-350ھ) کے کتب خانے میں ایک لاکھ کے قریب کتب موجود تھیں اور اس نے ابو الفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی کا پہلا نسخہ بہت خطیر رقم بھیج کر منگوایا تھا، تاہم اس دور میں یورپ والوں کی جہالت کا یہ عالم تھا کہ ایک تحقیق کے مطابق چھوٹے درجے کے کلیسا کے پاس صرف درجن بھر کتب ہوتی تھیں اور درمیانے درجے کے کلیسا کے پاس چند سو۔ نویں صدی عیسوی میں یورپ میں کتابوں کا



سب سے بڑا ذخیرہ صرف 500 کتابوں پر مشتمل تھا، جبکہ قرونِ وسطی کے اختتام تک ایوینان (Avignon) فرانس کی پاپائی لائبریری اور سوربن (Sorbonne) کی پیرس (Paris) لائبریری صرف دو دو ہزار کتب پر مشتمل تھیں۔

کتاب کو کتاب کیوں کہتے ہیں؟

''کتاب'' کا لفظ عربی سے لیا گیا ہے اور عربی میں ''کتاب'' ایک مجموعے کو کہتے ہیں جس میں مختلف چیزیں جمع ہوں، اسی لیے عربی میں ''کَتِیبہ'' لشکر کو بھی کہتے ہیں، یعنی مختلف افراد کا مجموعہ۔ اسی طرح عربی میں ''کَتَبَ'' کا لفظ ''خَطَّ'' (سطریں بنانا یا لکھنا) کا مفہوم بھی دیتا ہے۔

کتاب کے لیے انگریزی میں Book کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ Book قدیم انگریزی کے لفظ Boc (بوک) سے لیا گیا ہے اور خود Boc بھی جرمن زبان کے لفظ Bok سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں ''زان درخت جیسا۔'' زان کے درخت کے پتے بڑے ہوتے تھے اور لکھنے کے کام آتے تھے، چنانچہ ''بوک'' میں تبدیلی ہوتے ہوتے یہ لفظ Book بن گیا۔

کتاب کی تاریخ

کتاب ورقوں سے مل کر بنتی ہے۔ ان ورقوں کی جگہ پہلے مٹی یا لکڑی کی تختیاں استعمال ہوتی تھیں، سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر تختیوں پر لکھی ہوئی صورت میں کتاب نازل ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ ''اور ہم نے تختیوں میں موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہر چیز لکھ دی۔'' (الاعراف 145:7) قرآن مجید میں ''الواح'' کا لفظ ایک مقام پر کشتی کے تختوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ (القمر 13:54) اس وجہ سے غالب گمان یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو ملنے والی تختیاں لکڑی کی ہوں گی۔ تھوڑی سی ترقی ہوئی تو ان تختیوں پر موم وغیرہ لگا دیا جاتا تھا جس سے تختی دوبارہ استعمال کے قابل ہو جاتی۔

عہد نبوت میں بھی کئی چیزوں کو ''ورق'' کے طور پر استعمال کرنے کا تذکرہ ملتا ہے۔ قرآن مجید کو جمع کرنے کا مسئلہ پیش آیا تو سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کے مختلف حصے متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے حاصل کیے۔ ان میں سے کئی حصے کھال پر، کئی پتھر کی باریک سلوں پر، کئی کھجور کی شاخوں پر اور کئی ہڈی وغیرہ پر لکھے ہوئے تھے۔ (صحیح البخاری: 4679,4986) یہ ایک تاریخ کا مستند ترین حوالہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم و بیش 1500 سال پہلے ان مذکورہ اشیاء کو بھی ورق کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

اسی طرح مصریوں نے نیل کے ساحل پر اگنے والے پاپائرس پودے کے تنے کے گودے سے کاغذ کی طرح کے چوڑے چوڑے اوراق بنانے شروع کیے۔ ان پر لکھنے کے لیے قلم نہیں بلکہ آہنی آلات استعمال کیے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مصریوں کے پانچویں بادشاہ نیفرتیتی کاکائی (Nefertiti Kakai) نے سب سے پہلے ان اوراق یا پارچوں کو گوندنما چیز سے جوڑ کر ایک ملفوف کتاب (Scroll) کی شکل دی۔

یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ ایک کتاب کے کئی نسخے تیار کروانے ہوتے تو کاتبوں کی مدد سے یہ کام لیا جاتا جیسا کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں قرآن مجید کو ایک قراءت پر اکٹھا کر کے اس کے کئی نسخے تیار کروائے گئے اور انھیں بلاد اسلامیہ میں بھجوا دیا گیا۔ (صحیح البخاری: 4987) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد تک اتنی آسائش ہو چکی تھی کہ عہد عثمانی میں باقاعدہ قرآن مجید کے نسخے تیار کیے گئے۔ ظاہر ہے وہ عہد نبوی کی طرح مختلف قسم کی اشیاء پر نہیں بلکہ ایک ہی قسم کے صفحات وغیرہ پر لکھے گئے ہوں گے۔ اصطلاح میں اسے مخطوطے کا نام دیا جاتا ہے۔ مخطوطہ تیار کرنے کی تاریخ دوسری صدی بتائی جاتی ہے۔

کتاب کی تشکیل میں پانچ طرح کے کاتب حصہ لیتے تھے: ① خطاط: جو کتاب لکھتے تھے۔ ② نقال: جو کتاب میں مطابقت اور ربط کا خیال رکھتے تھے۔ ③ اصلاح کار: جو کتاب کا اصل نسخے سے موازنہ کرتے تھے۔ ④ شارح: جو حاشیے وغیرہ لکھتے تھے۔ ⑤ وضاح: جو عنوانات دیتے اور وضاحت کرتے تھے۔

کتاب تشکیل دینے کا عمل خاصا لمبا اور محنت طلب تھا۔ پارچات تیار کیے جاتے اور ان کو علیحدہ علیحدہ ایک ترتیب میں رکھا جاتا اور رسی سے باندھ دیا جاتا۔ اس کے بعد کاتب وہ



تحریر لکھتا اور شرح اور عنوانات کے لیے خالی جگہ چھوڑ دیتا، پھر یہ کتاب جلد ساز کو جلد کے لیے دی جاتی۔ لکھائی کے لیے عموماً سرخ رنگ استعمال کیا جاتا تھا اور بسا اوقات کتاب کو قیمتی بنانے کے لیے سونے کے پانی سے بھی لکھائی کی جاتی تھی۔

نسخے تیار کرنے میں عربوں کی ایک تکنیک

عربوں نے بھی اسلام کے وسطی زمانے میں طباعت میں کئی نئی ایجادات کیں۔ انھوں نے کتاب کی نقول تیار کرنے کا ایک نیا طریقہ متعارف کروایا، مسودہ پڑھا جاتا اور بیٹھے ہوئے تمام کاتب وہ لکھ لیتے۔ اس طرح ایک کتاب کی کئی نقول تیار کی جاتیں اور وہاں موجود کاتبوں کو ایک ایک نقل دی جاتی۔ ان میں سے ایک کاتب مصنف کی موجودگی میں اپنے پاس موجود نقل بلند آواز سے پڑھتا جو اصل کتاب سے تیار کی جاتی تھی اور تمام کاتب اپنے اپنے نسخے پہلے والے نسخے کے مطابق کر لیتے۔ اس طرح ایک وقت میں ایک کتاب کی کئی نقول تیار ہو جاتی تھیں۔

لکڑی کے ذریعے پرنٹنگ

اسی طرح طباعت کا ایک اور طریقہ بھی رائج ہوا اور وہ یہ تھا کہ لکڑی کے ایک بلاک پر ایک صفحے کی تحریر کی کھدائی کی جاتی اور سیاہی کے ذریعے اس صفحے کی کئی نقول تیار کر لی جاتیں۔ اس کے لیے دستی مشین استعمال ہوتی تھی، کاغذ بھی خود ہی آگے کرنا پڑتا تھا۔ آج کل آپ اسے مہر (Stemp) لگانے سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ سٹیمپ میں لفظ ابھرے ہوتے ہیں جبکہ اس میں کندہ ہوتے تھے۔ راقم نے اپنے پڑدادا جان مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی رحمہ اللہ کے وقت کے لکڑی کے بلاک دیکھے ہوئے ہیں جن پر الفاظ کندہ ہوتے تھے۔ ان کے ذریعے وہ ''مسلمان کمپنی'' کی کتب شائع کیا کرتے تھے۔

بہرحال اس طریقے سے نقول تیار کرنے کا طریقہ چین میں تیسری صدی عیسوی کے دوران میں شروع ہوا اور اسی طریقے سے کپڑوں کی چھپائی کا کام بھی کیا جاتا تھا جو مشرقی ایشیا میں پھیلا ہوا تھا۔

کتابوں کی چھپائی کا کام تو تیسری صدی عیسوی ہی میں شروع ہو چکا تھا لیکن باقاعدہ تاریخ کے ساتھ پہلی کتاب کی طباعت 11 مئی 868ء کو چین میں کی گئی جس کا نام ''Diamond Sutra'' تھا۔

1045ء میں ایک چینی باشندے نے آسانی سے حرکت دیے جانے والے، مٹی سے پرنٹنگ کے آلات ایجاد کیے لیکن وہ مقبولیت حاصل نہ کر سکے۔

اس کے بعد یورپ کے ایک باشندے یوہانس گوٹن برگ (Johannes GutenBerg) نے 1450ء میں پرنٹنگ پریس تیار کیا جس سے جدید پرنٹنگ کی بنیاد پڑی، اس کے ساتھ اس نے آسانی سے حرکت دیے جانے والے قالب اور سانچے تیار کیے جس سے کتاب کی تیاری نہایت آسان ہوگئی۔ پھر 1474ء میں ولیم کیکسٹن نامی انگریز نے ایک چھاپہ خانہ بنایا۔ یوہانس گوٹن برگ کے طریقے کے مطابق تیار کیے گئے سانچوں اور قالبوں پر سیاہی لگا کر انھیں کاغذ پر پیسٹ کر دیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ بیسویں صدی عیسوی تک چلتا رہا۔

جدید پرنٹنگ میں برق پاروں کا استعمال کیا جاتا ہے اور ایسے پرنٹر تیار کیے جاتے ہیں جن سے سیاہی (Tonner) پر منفی چارج پیدا کیا جاتا ہے اور کاغذ پر مثبت چارج آجاتا ہے، پورے کاغذ پر مثبت چارج نہیں ہوتا بلکہ جہاں جہاں الفاظ آتے ہیں، مثبت چارج وہیں پیدا ہوتا ہے اور سیاہی کے منفی چارج کے حامل ذرات، مثبت چارج کے ساتھ جا کر چمٹ جاتے ہیں جس سے چارج تو ختم ہو جاتا ہے جبکہ سیاہی کے ذرات اپنی مخصوص جگہ پر چپکے رہتے ہیں۔

کتاب کیسے وجود میں آتی ہے؟

کتاب کی تالیف کے اسباب کئی ایک ہوتے ہیں، مثلاً: اپنی فکر کی ترویج، تجربات و مشاہدات کا ریکارڈ، علم و دانش کی اشاعت، دعوت و اصلاح، تحقیق و تنقید، تشہیر اور کمائی وغیرہ اور کئی کتابیں اچانک وجود میں آجاتی ہیں۔ عربی کی ایک کتاب کا نام ہے: «المعجم المفصل فی الجموع» اس کے مولف امیل بدیع یعقوب ہیں۔ اس کتاب کا انتساب انھوں نے اپنے بیٹے کے نام کیا ہے۔ میں نے یہ منفرد انداز دیکھا تو کتاب کا مقدمہ پڑھا اس میں مولف نے سبب تالیف یہ ذکر کیا تھا: ''ایک دن میرا بیٹا سکول سے بڑی ناگواری



کی حالت میں واپس آیا، میں نے سبب پوچھا تو کہنے لگا کہ میں نے ''ثَور'' (بیل) کی جمع ''اثوار'' بتادی تھی جس کی وجہ سے میں گرائمر کا مقابلہ جیت نہیں سکا۔ میں نے بیٹے سے کہا: ''بیٹا جی! ''ثَور'' کی جمع ''اثوار'' تو بالکل درست ہے۔'' بیٹا کہنے لگا: ''میری ٹیچر نے ''ثَور'' کی جمع ''ثِیران'' بتائی ہے اور یہی جمع نہ بتانے پر میرے نمبر کاٹ لیے ہیں۔'' مولف لکھتے ہیں کہ ٹیچر سے میری شناسائی تھی۔ میں نے فون پر رابطہ کیا اور کہا ثور کی جمع اثوار تو درست ہے۔ اس نے یہ جواب دیا کہ میں جو لغت کی کتاب استعمال کرتی ہوں اس میں اس کی جمع ''اثوار'' نہیں لکھی ہوئی..... پھر میں نے سوچا جو میرے بیٹے کے ساتھ ہوا، کسی اور کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے، لہٰذا میں نے زیر نظر کتاب لکھنے کا تہیہ کرلیا..... اس طرح مولف نے 500 صفحات پر مشتمل کتاب لکھ ڈالی۔

کتاب کیسے تیار ہوتی ہے؟

یہ بھی ایک دلچسپ مرحلہ ہے۔ سب سے پہلے کتاب کا متن (Script) مسودے کی شکل میں تیار ہوتا ہے۔ کمپیوٹر کی ایجاد سے پہلے اس مسودے کو کاتب لکھتے تھے اور ٹائپ رائٹر کے ذریعے بھی مسودہ لکھا جاتا تھا۔ آج کل تو قرآن مجید اور کتابوں کے سرورق (ٹائٹل) کے سوا سب کچھ کمپوز ہی ہوتا ہے۔ کمپوزنگ کے بعد پروف ریڈنگ ہوتی ہے اور کوئی تبدیلی وغیرہ کرنی ہو تو وہ آسانی سے ہوجاتی ہے کیونکہ کمپیوٹر میں یہ سب سہولیات میسر ہیں جبکہ اس سے پہلے کاتب سے تصحیح کرانا ایک مشکل ترین مرحلہ ہوتا تھا اور لکھے ہوئے میں تبدیلی یا اضافہ محال تھا۔ مسودے کی کمپوزنگ، ڈیزائننگ اور سیٹنگ کے بعد Butter Paper پر اس سارے مواد کو اتار لیا جاتا ہے جسے ٹرینگ کہتے ہیں۔ یا پھر اچھے رزلٹ کے لیے کسی سکینر سے پازیٹو بنوا لیے جاتے ہیں اور سائز کے مطابق پیپرز کی کاپی پیسٹنگ کر دی جاتی ہے، یعنی پریس میں جس سائز کی شیٹ پر یہ چھپنا ہوتا ہے اس کے مطابق 16,8 یا 32 صفحات ایک بڑے صفحے پر اس طرح جوڑے جاتے ہیں کہ جب اس صفحے کو فولڈ کیا جائے تو صفحات کی ترتیب درست رہے۔ کتاب کے جتنے صفحات ہوں اسی تناسب سے کاپیاں یعنی پیسٹ شدہ بڑے صفحات تیار ہوجاتے ہیں۔

پھر ان کاپیوں کو خاص روشنی کی مدد سے جست کی بنی پلیٹ پر منتقل کیا جاتا ہے اور کاپی پر جو کچھ ہوتا ہے وہ سب کا سب اس پلیٹ پر آجاتا ہے، اس پلیٹ کو سائز کے مطابق متعلقہ مشین پر ایڈجسٹ کر دیا جاتا ہے، پریس مشین ایک طرف سے پیپر اٹھاتی ہے اور پلیٹ پر موجود سارا مواد اس کاغذ پر منتقل کر دیتی ہے۔ اس طرح اس کاغذ کی دوسری جانب دوسرا فرما چھپ جاتا ہے۔ کتاب کے تمام فرمے چھپ جائیں تو انھیں ترتیب سے علیحدہ علیحدہ رکھا جاتا ہے، پھر انھیں مشین یا ہاتھوں سے فولڈ کیا جاتا ہے۔ پھر ہر کاپی یا فرما علیحدہ علیحدہ سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور ترتیب سے ایک ایک کاپی اٹھا کر ایک مجموعہ تیار ہوجاتا ہے۔ اگر کتاب سنگل کلر ہو تو ایک دفعہ پریس سے گزرتی ہے اگر 2 کلر ہو تو دو دفعہ اور اگر 4 کلر ہو تو چار دفعہ گزارا جاتا ہے اور ہر دفعہ ایک ایک رنگ چھپتا ہے۔ مگر اب مزید جدت اور ترقی ہوگئی ہے اب کمپیوٹرائزڈ مشینیں ہیں جن میں ایک ہی دفعہ 6 اور 8 رنگ چھپ جاتے ہیں اور پیسٹنگ کے مرحلے سے بھی نجات مل گئی ہے۔ مشین خود ہی پیسٹ کر کے متعلقہ صفحات چھاپ دیتی ہے۔

ایک طرف کتاب کا سارا مواد چھپ کر فولڈ ہوجاتا ہے اور اس کی ایک ڈمی بن جاتی ہے تو دوسری طرف کتاب کا ٹائٹل چھپ جاتا ہے۔ پھر کتاب کی ڈمی اور ٹائٹل کو صفحات کی تعداد یا چھپوانے والے کی ڈیمانڈ کے مطابق پن، سلائی اور گم وغیرہ کے ذریعے سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ اگر کارڈ کور ٹائٹل ہو تو کتاب کے 50,50 نسخے کٹنگ مشین کے نیچے رکھ کر تینوں اطراف سے برابر کاٹ لیے جاتے ہیں اور اگر جلد والی ہو تو پہلے ڈمی تینوں اطراف سے کاٹی جاتی ہے اور بعد میں جلد اس سے چمٹا دی جاتی ہے۔

اس طرح کتاب تیار ہوکر ناشر کے پاس آتی ہے، پھر وہ کتاب ڈسٹری بیوٹرز یا ناشر کے شوروم پر پہنچ جاتی ہے اور وہاں سے آپ جا کر خرید لاتے ہیں یا کوئی خرید کر آپ کو ہدیہ کر دیتا ہے۔ اور جب آپ اس کے مطالعے میں منہمک ہوتے ہیں تو یہی کتاب ایک خاموش مبلغ کے طور پر کبھی آپ کو ہنساتی ہے، کبھی رلاتی ہے، کبھی آنسو صفحات پر گرتے ہیں، کبھی



کتابوں پر لہو بکھرتا ہے، کبھی جذبات ابھرتے ہیں، کبھی خواہشات جھلکتی ہیں، کبھی خیال بدلتے ہیں، کبھی دل مچلتے ہیں، کبھی کپکپی طاری ہوتی ہے اور کبھی کتاب پڑھتے پڑھتے نیند آجاتی ہے۔ اچھی کتاب آپ کا بہترین ساتھی ہے۔ اس سے راہ نمائی لیں۔

کتاب کی پکار

جب کتابیں الماری میں بند پڑی رہتی ہیں تو وہ گرد سے اٹ جاتی ہیں اور انھیں کتابی کیڑے لگ جاتے ہیں۔ اس وقت کتاب اپنی زبان میں آپ سے سوال کرتی ہے کہ تم نے مجھے خریدا کیوں تھا؟ اگر بطور ہدیہ تم تک پہنچی ہوں تو ہدیہ کرنے والے نے مجھے ناقدردان کے حوالے کیوں کیا؟ آپ بھی کبھی اپنی لائبریری کی کتابوں کا جائزہ لیں تو کتابوں کی یہ پکار آپ بھی محسوس کریں گے۔ جو شخص کتاب پڑھتا تو ہے مگر کردار میں تبدیلی نہیں لاتا تو کتاب اس سے بھی سوال کرتی ہے کہ مجھے پڑھنے کا مقصد محض علم وفن میں اضافہ ہی نہیں بلکہ کردار میں بہتری لانا ہے۔ اور جو لوگ کتابوں کا ادب نہیں کرتے، انھیں پھینکتے ہیں، ان پر سیاہی چھڑکتے ہیں، کبھی ان کے صفحات سے سیاہی پونچھتے ہیں، کبھی اسے دوہرا کرتے ہیں، کبھی اس کی جلد دوہری کرتے ہیں، نامناسب جگہوں پر رکھ دیتے ہیں، ان پر ایسی ویسی چیزیں لکھ دیتے ہیں، کتاب ان سے خفا خفا رہتی ہے، ان کے ہاتھ میں جچتی ہی نہیں گویا وہ اپنے مالک کی شکایت کر رہی ہوتی ہے۔

ادھار کتابیں

بعض لوگوں کو پڑھنے کا شوق ہوتا ہے مگر جیب اجازت نہیں دیتی۔ وہ بک سٹالوں یا بک کارنر پر جاتے ہیں اور روزانہ ایک کتاب کا کچھ حصہ پڑھ آتے ہیں۔ کئی لوگ پرانی کتابیں کم قیمت پر خرید کر اپنا شوق مطالعہ پورا کرتے ہیں اور بعض لوگ کتابیں ادھار مانگتے ہیں۔ کتابیں ادھار دینا بڑا بوجھل محسوس ہوتا ہے۔ ایک عربی شاعر نے اس کی خوب ترجمانی کی ہے:

اَلَا يَا مُسْتَعِيرَ الْكُتُبِ مِنِّى
فَإِنَّ إِعَارَتِى لِلْكُتُبِ عَارُ
مَحْبُوبِى مِنَ الدُّنْيَا كِتَابُ
فَهَلْ أَبْصَرْتَ مَحْبُوبًا يُعَارُ

''مجھ سے کتابیں عاریتاً لینے والو! کتابیں ادھار دینا تو میرے لیے بہت بڑی عار ہے، کیونکہ دنیا میں میری محبوب چیز کتاب ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ ''محبوب'' بھی کسی کو ادھار دیا جاتا ہے؟''

آخری بات

جیسے خالق اور مخلوق میں فرق ہے، اسی طرح خالق اور مخلوق کی کتابوں میں بھی فرق ہے، لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم تمام آسمانی کتابوں پر ایمان رکھیں اور قرآن مجید جو سابقہ آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اس کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کریں۔ اور زندگی کے لمحات میں اسے پڑھنے، سمجھنے اور دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ مضمون پر تحقیق کے دوران میں راقم نے دارالسلام شعبہ تحقیق کے رفیق نجم الحسن صاحب کو زحمت دی کہ مجھے سرچ کر کے بتائیں کہ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب، سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب اور سب سے زیادہ چھپنے والی کتاب کون سی ہے اور کس کتاب کے ترجمے سب سے زیادہ شائع ہوئے ہیں تو ان کے دو تین ویب سائٹس کھنگالنے کے بعد ان تمام سوالوں کا جواب ایک ہی تھا اور وہ تھا: ''بائبل۔'' لیکن حقیقت یہ ہے کہ بائبل سب سے زیادہ چھپنے اور فروخت وتقسیم ہونے والی کتاب تو ہوسکتی ہے مگر سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہرگز نہیں۔ یہ اعزاز صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب قرآن حکیم کو حاصل ہے۔ جس کی کروڑوں مسلمان تلاوت کرتے اور اسے حفظ کرتے ہیں۔ بہرحال یہ سوال اپنی جگہ ہے کہ بائبل کی کثیر اشاعت وتقسیم کے پیش نظر کیا مسلمان اپنی سچی، عالمگیر اور جامع ترین کتاب قرآن مجید کو اس سطح پر لانے کے لیے کوشش کریں گے؟ دارالسلام کے مینجنگ ڈائریکٹر مولانا عبدالمالک مجاہد نے اس عزم کا اظہار کیا ہے۔ آیئے! آگے بڑھ کر ان کا ساتھ دیجیے۔

عالمی یوم کتاب پر اگر ہم اس جذبے سے سرشار ہو جائیں تو امید کی جاسکتی ہے کہ ہم ''یوم حساب کتاب'' کو بھی رب تعالیٰ کے سامنے سرخرو ہوجائیں گے۔

”نام“ سے متعلق احکام

حافظ شبیر صدیق
ریسرچ فیلو دارالسلام

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”بے شک تمھارے ناموں میں سے ”عبداللہ“ اور ”عبدالرحمٰن“ اللہ کے ہاں محبوب ترین نام ہیں۔“

(صحیح مسلم: 2132)

”انبیاء کے ناموں پر اپنے نام رکھو۔“

(سنن أبی داود: 4950)



جب بھی کسی کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو والدین اور دیگر رشتے داروں میں ایک ہی بات گردش کرتی ہے کہ اس کا نام کیا رکھا جائے؟ سب کی یہی خواہش اور تمنا ہوتی ہے کہ کوئی اچھا اور منفرد نام رکھا جائے۔ خصوصاً اس حوالے سے ائمہ مساجد اور علمائے کرام سے بھی رہنمائی لی جاتی ہے۔ مگر بعض اوقات نام میں انفرادیت کی خاطر ایسا نام رکھ دیا جاتا ہے جو نہ تو معنی ومفہوم کے اعتبار سے صحیح ہوتا ہے اور نہ ہی مسلم معاشرے سے میل کھاتا ہے۔ خصوصاً یورپ سے متاثر طبقہ، بچوں کے نام رکھنے میں کچھ خاص خیال نہیں رکھتا۔ عموماً ان کے نام یورپین افراد سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔

بچے کی پیدائش کے بعد اہم امور میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بچے کے لیے اچھے نام کا انتخاب کیا جائے۔ نام کا بچے کی شخصیت پر بہت اثر پڑتا ہے۔ خصوصاً قرونِ اولیٰ کی شخصیات کے نام پر بچوں کا نام رکھنا ان شخصیات کے ساتھ بچوں کے تعلق کو مزید مضبوط کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ جب بچے کو پتہ چلے گا کہ اس کا نام ایک عظیم شخصیت کے نام پر رکھا گیا ہے تو وہ اپنے آپ کو اسی کی مثل بنانے کی کوشش کرے گا۔ بعینہٖ اگر کسی بچے کا نام دنیا میں نام کمانے والے مگر دین سے بیگانہ شخصیت کے نام پر رکھا جائے تو وہ بچہ بھی اپنے آپ کو سیکولر بنانے کی کوشش کرے گا۔

ذیل میں ہم شریعت کی روشنی میں ”نام“ سے متعلقہ چند گزارشات پیش کرتے ہیں۔

بچے کا نام کب رکھا جائے؟

بچے کی ولادت کے بعد ایک اہم معاملہ اس کا نام رکھنے کا ہے۔ نام کب رکھا جائے؟ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «كُلُّ غُلَامٍ رَهِينَةٌ بِعَقِيقَتِهِ، تُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ سَابِعِهِ وَيُحْلَقُ وَيُسَمَّى» ”ہر بچہ اپنے عقیقے کے بدلے گروی ہوتا ہے، ساتویں دن اس کی طرف سے جانور ذبح کیا جائے اور اسی دن اس کا سر مونڈا جائے اور نام رکھا جائے۔“ (سنن أبی داود: 2838) مذکورہ حدیث میں ساتویں دن بچے کا نام رکھنے کا حکم ہے، البتہ بعض روایات میں پہلے دن ہی بچے کا نام رکھ دینے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جب نبی ﷺ کے ہاں رات کے وقت ایک بچے کی ولادت ہوئی تو اگلے دن آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو اس کی خبر دیتے ہوئے فرمایا: «وُلِدَ لِيَ اللَّيْلَةَ غُلَامٌ، فَسَمَّيْتُهُ بِاسْمِ أَبِي،



إِبْرَاهِيمَ» ''آج رات میرے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ میں نے اس کا نام اپنے باپ ابراہیم (علیہ السلام) کے نام پر رکھا ہے۔ (صحیح مسلم: 2315)

اچھے نام کا انتخاب

بچے کے لیے اچھے نام کا انتخاب کرنا بھی ایک اہم معاملہ اور بچے کا حق ہے۔ بچے کے لیے ایسے نام کا انتخاب کیا جائے کہ جب اسے اس نام سے پکارا جائے تو اس کی ذات میں کوئی تنقیص کا پہلو نہ پایا جائے۔ یہ نہ ہو کہ بچہ اس نام کے پکارے جانے پر لبیک (Yess sir) کہنے کے بجائے اپنا چہرہ چھپاتا پھرے۔ کوئی بھی اچھا نام کسی فرد کی شخصیت کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں بہترین نام

نبی ﷺ نے جہاں اچھے ناموں کی ترغیب دلائی ہے، وہاں نمونے کے طور پر چند اچھے اچھے نام بھی بیان فرمائے ہیں۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ أَحَبَّ أَسْمَائِكُمْ إِلَى اللّٰهِ عَبْدُاللّٰهِ وَعَبْدُالرَّحْمٰنِ» ''بے شک تمھارے ناموں میں سے ''عبداللہ'' اور ''عبدالرحمٰن'' اللہ کے ہاں محبوب ترین نام ہیں۔'' (صحیح مسلم: 2132) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «تَسَمَّوا بِأَسْمَاءِ الْأَنْبِيَاءِ» ''انبیاء کے ناموں پر اپنے نام رکھو۔'' (سنن أبی داود: 4950 و صحیح الترغیب و الترهیب: 2/206) حارث اور ھمام بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ناموں میں سے ہیں۔ (سنن أبی داود: 4950)

اللہ تعالیٰ کے ہاں بدترین نام

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''ہر نبی پر یہ واجب تھا کہ وہ اپنی امت کو خیر اور شر کی تمام باتیں بتا دے۔ (صحیح مسلم: 1844) رسول اللہ ﷺ نے اچھے ناموں کی طرف رہنمائی کے ساتھ ساتھ برے ناموں سے بھی آگاہ کیا۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بدترین آدمی وہ ہوگا جس نے اپنا نام ''ملک الاملاک'' (بادشاہوں کا بادشاہ) رکھا۔ اس لیے کہ بادشاہوں کی بادشاہ ذات صرف اللہ کی ذات ہے۔'' (صحیح البخاري: 6205، و صحیح مسلم: 2143)

اسی طرح لفظ ''شہنشاہ'' بھی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے خاص ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ کسی سادہ طبیعت یا عقلی طور پر ''بھینگے شخص'' پر تعجب کا اظہار کرنے کے لیے اسے ''شہنشاہ'' کہہ دیتے ہیں۔ چونکہ یہ صفت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے جو ہر طرح کے نقص سے پاک ہے، اس لیے کسی اور کے لیے استعمال کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔

نبی ﷺ کے منع کردہ نام

احادیث میں بعض ایسے نام منقول ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اپنے بچوں کا نام افلح، رباح، یسار اور نافع رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: اگر کسی کا نام ''افلح'' ہوگا تو جب اس کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ کیا یہاں افلح (نجات پانے والا) ہے؟ اگر وہ شخص وہاں نہیں ہوگا تو جواب دینے والا کہے گا: ''نہیں، یہاں افلح (فلاح پانے والا) نہیں ہے۔'' (صحیح مسلم: 2136-7) ایک اور روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کلب (کتا) اور کلیب نام رکھنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ (المعجم الأوسط: 8/21) احادیث میں بکثرت ایسے واقعات ملتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے نام تبدیل کر دیے جو معنی اور مفہوم کے اعتبار سے درست نہیں تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: «أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُغَيِّرُ الِاسْمَ الْقَبِيحَ» ''رسول اللہ ﷺ قبیح نام بدل دیا کرتے تھے۔'' (جامع الترمذي: 2839) ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ جویریہ بنت حارث کا نام ''بَرَّہ'' تھا۔ آپ ﷺ نے ان کا نام تبدیل کر کے جویریہ رکھ دیا۔ (مسند احمد 1/316)

مذکورہ احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کسی کا نام درست نہ ہو تو اس کو اپنا نام بدل لینا چاہیے، بعض لوگ نام غلط ہونے کے باوجود بھی تبدیل نہیں کرتے ہیں، ان کا یہ عمل شرعی تعلیمات کے خلاف ہے۔

نام کا شخصیت پر اثر

بچے کا اچھا نام رکھنے اور غلط نام کو اچھے نام میں بدل دینے کی شریعت میں بہت ترغیب دی



گئی ہے۔اس کی بنیادی وجہ اچھے یا برے نام میں پائی جانے والی تاثیر ہے۔ ناموں کے مؤثر ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ناموں کے مؤثر ہونے میں بہت ساری روایات کتب احادیث میں منقول ہیں۔ دورِ جاہلیت میں بھی ناموں کی تاثیر کا نظریہ پایا جاتا تھا۔حلیمہ سعدیہ جب نبی ﷺ کو لینے کے لیے عبدالمطلب کے پاس آئیں تو عبدالمطلب نے ان سے ان کا اوران کے قبیلے کا نام پوچھا۔ جب حلیمہ سعدیہ نے اپنا نام حلیمہ اور قبیلے کا نام سعد بتایا تو عبدالمطلب نے نام سن کر خوشی کا اظہار کیا اور نیک شگون لیا۔(تحفة المودود باحكام المولود لابن قيم: 124/1) اسلم اور غفار قبائل کے ناموں کی نسبت سے رسول اللہ ﷺ نے دعا دیتے ہوئے فرمایا: «غِفَارُ غَفَرَ اللّٰهُ لَهَا، وَأَسْلَمُ سَالَمَهَا اللّٰهُ» ''اللہ تعالیٰ قبیلۂ غفار کی مغفرت فرمائے اور قبیلۂ سالم کو سلامت رکھے۔'' اسی طرح عصیہ قبیلے کے بارے میں فرمایا: «عُصَيَّةُ عَصَتِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ» ''عصیہ قبیلے نے اللہ اوراس کے رسول کی نافرمانی کی۔''(صحيح البخاري: 3513)

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب مشرکین کی طرف سے سہیل بن عمرو کو بھیجا گیا تو نبی ﷺ نے ان کو دیکھ کر فرمایا: «قَدْ سَهُلَ لَكُمْ مِنْ أَمْرِكُمْ» ''اب تمھارا کام آسان ہو گیا۔'' (صحيح البخاري: 2731) سعید بن مسیّب کہتے ہیں کہ میرے دادا ایک مرتبہ نبی ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: «مَا اسْمُكَ» ''تمھارا نام کیا ہے؟'' انھوں نے کہا: ''میرا نام حزن ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، آج کے بعد آپ کا نام ''سہل'' ہے۔'' انھوں نے کہا: ''نہیں، میرے باپ نے میرا جو نام رکھا ہے میں اسے تبدیل نہیں کروں گا۔'' سعید بن مسیّب کہتے ہیں کہ (ان کے نام تبدیل نہ کرنے کی وجہ سے) ''سختی'' ہمارے خاندان میں ہمیشہ برقرار رہی۔''(صحيح البخاري: 6193)

مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کسی بھی فرد کی شخصیت پر اس کے نام کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے پہلی بات تو یہ کہ نام رکھتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا جائے کہ نام کا معنی ومفہوم درست ہو لیکن اگر کسی کا نام ایسا رکھ دیا گیا ہو جو معنی ومفہوم کے اعتبار سے درست نہ ہو تو اسے چاہیے کہ اپنے نام کو اچھے اور بہتر نام سے تبدیل کر لے تاکہ اس کی شخصیت پر کوئی غلط اثر نہ پڑے۔

حروف مقطعات کو بطور نام رکھنا

ہمارے معاشرے میں بعض ایسے نام رائج ہیں جن کا کوئی معنی ومفہوم نہیں ہوتا ہے، ان ناموں میں سے بعض قرآنی سورتوں کے نام بھی ہیں، مثلاً: طٰهٰ، يٰسٓ وغیرہ، درحقیقت یہ حروف مقطعات کا مجموعہ ہیں جو بطور نام رکھنا درست نہیں ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ اس بارے میں فرماتے ہیں: قرآن کے بعض ناموں یا بعض سورتوں کے نام پر بچوں کے نام رکھنا ممنوعات میں سے ہے جیسے طٰهٰ اور يٰسٓ وغیرہ۔عوام الناس میں یہ بات مشہور ہے کہ يٰسٓ اور طٰهٰ نبی ﷺ کے ناموں میں سے ہے۔عوام الناس کی یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ اس بارے میں کوئی بھی صحیح یا حسن روایت منقول نہیں ہے۔ دوسرے حروف مقطعات کی طرح یہ بھی حروف مقطعات ہی ہیں۔جس طرح الٓمٓ، صٓ یا كٓهٰيٰعٓصٓ کو بطور نام نہیں رکھا جاتا اسی طرح طٰهٰ یا يٰسٓ وغیرہ نام رکھنا بھی درست نہیں ہے۔(تحفة المودود: 127/1)

بزرگوں کی طرف منسوب نام

عقیدے کی خرابی کی بنیاد پر ہمارے معاشرے میں بعض بزرگوں کے ایسے نام یا القابات رکھ دیے گئے ہیں جو شرعاً ناجائز اور ممنوع ہیں، جب ان ناموں کے معنی ومفہوم پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو ان ناموں سے نوازنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ان میں سے بعض نام درج ذیل ہیں: گنج بخش، دستگیر، غریب نواز، غوث اعظم اور داتا وغیرہ۔

لفظ ''عبد'' کی نسبت.....!

لفظ ''عبد'' کی نسبت ''اسماء حسنیٰ'' کی طرف کرنا ایک مستحسن عمل ہے۔ نبی ﷺ نے ایسے ناموں کو اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ ترین نام قرار دیا ہے۔ اسماء حسنیٰ کے علاوہ کسی اور نام کی طرف نسبت کرنا شرعاً ناجائز ہے، مثلاً: عبدالنبی، عبدالرسول، عبد علی، عبدالحسین وغیرہ۔ دور جاہلیت میں ایسے نام بکثرت رکھے جاتے تھے



مگر اسلام نے ایسے تمام ناموں سے منع فرما دیا جن میں اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے عبدیت کا معنی پایا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ایک قوم میں تشریف لے گئے تو وہاں آپ ﷺ نے دیکھا کہ لوگ ایک آدمی کو ''عبدالحجر'' کے نام سے پکار رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: «مَا اسْمُكَ» ''تمھارا نام کیا ہے؟'' اس نے کہا: ''میرا نام عبدالحجر ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّمَا أَنْتَ عَبْدُاللّٰهِ» ''آج کے بعد تمھارا نام عبداللہ ہے۔''

(مصنف ابن ابی شیبہ:477/8)

اسی طرح وہ نام بھی ممنوع ہیں جن میں شرک کی بُو پائی جاتی ہو، ہمارے معاشرے میں اس طرح کے بہت سارے نام رائج ہیں جیسے پیراں دتہ وغیرہ۔ غلام غوث یا اسی طرح کے دیگر نام جن میں لفظ غلام کی نسبت اسماء حسنیٰ کے علاوہ کسی اور طرف ہو ان سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ غلام غوث اگرچہ نام تو ٹھیک ہے مگر ہمارے معاشرے میں ''علی ہجویری'' کی نسبت سے رائج ہے۔ شرعاً اس طرح کی نسبت ناجائز اور ممنوع ہے۔

شیطانی نام.....!

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے شیطان کو اہل ایمان کا دشمن قرار دیا ہے۔ شریعت نے ہر مسئلے میں اہل ایمان کی رہنمائی فرمائی ہے تاکہ شیطان کے حملوں سے محفوظ رہیں۔ شیطان نے خود بھی اس بات کا اعلان کیا تھا کہ وہ اہل ایمان کو ہر طرح سے گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کی اس بات پر فرمایا: ''جو شیطان کو اپنا دوست بنائے گا وہ خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔'' (النسآء 119:4)

جب اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرما دیا ہے کہ شیطان کو دوست بنانے والا یا اس کی پیروی کرنے والا خسارے میں ہے تو پھر ہمیں ہر حوالے سے کوشش کرنی چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور شیطان کو اپنا ازلی دشمن سمجھیں۔ ہر حوالے سے شیطان کی مخالفت کریں تاکہ اس کے ساتھ کسی اعتبار سے بھی ہمارا تعلق نہ ہو۔ کتب احادیث میں شیطان کے بعض چیلوں کے نام مذکور ہیں۔ چونکہ شیطان ہمارا ازلی دشمن ہے تو ہمیں ایسے ناموں سے بھی پرہیز کرنا چاہیے جو شیطانوں کے نام ہیں۔ وہ نام درج ذیل ہیں: خِنْزَبْ، وَلَهَان، اَعْوَر، اَجْدَع اور حُبَاب. (صحيح البخاري:7131، و صحيح مسلم:2203، و جامع الترمذي: 57، و سنن أبي داود: 4959، و مصنف ابن ابی شیبة:476/8)

الٹے نام رکھنا

ہمارے معاشرے میں ایک بہت ہی بری عادت رواج پا چکی ہے۔ کسی بھی بچے یا فرد کا کوئی ایسا نام رکھ دیا جاتا ہے جو اس کے اصل نام سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ جس کا وہ نام رکھا جاتا ہے وہ اسے ناپسند بھی کرتا ہے مگر اس کے باوجود اسے چڑانے کے لیے یا اسے بے عزت کرنے کی خاطر اس نام سے پکارا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک بری خصلت اصل نام کو بگاڑ دینے کی ہے، یعنی اگر کسی کا نام عبدالرحمٰن یا عمران ہے تو اسے ''مانی'' کہہ کر بلانا وغیرہ۔ عموماً ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ اگر کسی کی شکل و صورت کسی دوسرے آدمی سے ملتی ہو تو اسے اس دوسرے آدمی کے نام سے پکارا جانے لگتا ہے۔ قابل افسوس بات ہے کہ ایک مسلمان کو کسی کافر کے نام سے پکارا جانا بھی معاشرے میں عام ہو چکا ہے، مثلاً: بش، منموہن یا ٹونی بلیئر وغیرہ۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی مسلمان یہ پسند نہیں کرے گا کہ اسے بش، ٹونی بلیئر، یا منموہن کے نام سے پکارا جائے کیونکہ یہ سب اس وقت کے بڑے بڑے فرعون ہیں۔ اسی طرح کسی شخص کو کسی ''بدنامِ زمانہ شخصیت'' کے نام سے پکارا جانے لگتا ہے جو اس کے لیے تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔

کوئی بھی باعزت شخص اپنے آپ کو صدرِ پاکستان ''آصف علی زرداری'' کی نسبت سے زرداری کہلوانا پسند نہیں کرے گا۔ اگرچہ زرداری صدر پاکستان ہے مگر اس کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی بھی شخص اس کی طرف نسبت کو گوارا نہیں کرے گا۔ البتہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ کسی شخص کی حوصلہ افزائی کی خاطر کسی نیک، بزرگ یا عظیم شخصیت کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اچھا خطیب ہے تو بطور حوصلہ افزائی یہ کہنا کہ آپ تو ابوالکلام آزاد یا علامہ احسان الٰہی ظہیر ہیں وغیرہ تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر یہ بھی اس صورت میں ہے جب وہ شخص اس بات کو ناپسند نہ سمجھتا ہو۔

بہرحال کسی شخص کا کوئی الٹا نام یا ایسا لقب رکھنا جسے وہ سخت ناپسند کرتا ہو شرعاً ممنوع ہے۔



اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ﴾ ''ایک دوسرے کو برے ناموں کے ساتھ نہ پکارو۔''(الحجرات 49:11) مفسرین نے اس آیت کے مختلف معانی ذکر کیے ہیں۔ وہ سب کے سب معانی صحیح ہیں ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ مفسرین کے بیان کردہ معانی درج ذیل ہیں: ① اگر کوئی شخص پہلے کافر تھا اور بعد میں مسلمان ہوا تو اب اسے ''کافر'' یا ''مشرک'' کہہ کر بلانا سخت منع ہے۔ ② مسلمان ہونے کے بعد کوئی شخص نفاق میں مبتلا ہو گیا مگر بعد میں اس نے توبہ کر لی تو اسے ''منافق'' نہ کہا جائے۔ ③ اگر کسی شخص سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا اور اس نے اس پر نادم ہو کر توبہ بھی کر لی تو اسے اس گناہ کی نسبت سے نہ پکارا جائے، مثلاً: اگر کسی سے زنا ہو گیا یا اس نے کسی کی چوری کر لی تو اسے ''زانی'' یا ''چور'' کہہ کر نہ پکارا جائے۔ ④ کسی بھی مسلمان کو ''یہودی'' یا ''نصرانی'' کہہ کر پکارنے سے منع کیا گیا ہے۔ ⑤ کسی بھی آدمی کو کسی ایسے نام سے پکارنا جس کو وہ اپنے لیے ناپسند کرتا ہو تو اس سے منع کیا گیا ہے۔ ابو جبیرہ بن ضحاک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو بنی سلمہ میں سے کوئی بھی شخص ایسا نہیں تھا جس کے دو یا تین نام نہ ہوں۔ ایک مرتبہ نبی ﷺ نے ایک آدمی کو ایک نام سے بلایا۔ لوگوں نے آپ ﷺ کو بتایا کہ یہ شخص اس نام سے بلائے جانے پر بہت غصہ کرتا ہے۔ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ﴾ (سنن أبی داود: 4962)

⑥ اگر کسی شخص کے والد کافر یا گناہ گار تھے تو اس کی اولاد میں سے کسی کو ان کے والد کی وجہ سے عار نہ دلائی جائے۔ یعنی کوئی آدمی یہ نہ کہے: ''اے زانی کی اولاد!'' یا ''اے چور کی اولاد!'' (تفسیر ابن کثیر: 376/7، و تفسیر الطبري: 368/3، و تفسیر القرطبي: 328/16)

اگر کسی شخص میں جسمانی طور پر کوئی عیب پایا جاتا ہو تو اسے اس عیب کی نسبت سے پکارنا بھی ممنوع ہے۔ یعنی اگر کوئی آدمی پست قد ہے تو اسے ''کوڈو'' یا ''ٹھگنا'' کہہ کر بلانا یا اگر کوئی بصارت سے محروم ہے تو اسے ''کانا'' ''اَنّا'' یا ''نابینا'' کہہ کر پکارنا شرعاً قطعی ناجائز ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک دفعہ میں نے نبی ﷺ سے فرمایا: ''صفیہ تو پست قد یعنی ''ٹھگنی'' ہے۔'' آپ ﷺ نے میری اس بات پر فرمایا: ''اے عائشہ! تو نے ایک ایسی (قبیح) بات کہی ہے کہ اگر اسے سمندر کے پانی میں ڈال دیا جائے تو وہ سارے کا سارا پانی کڑوا ہو جائے۔''(سنن أبی داود: 4875)

نبی ﷺ نے بعض صحابہ کرام کو القابات سے نوازا

کسی اچھے کارنامے یا اچھی خصلت کی بنیاد پر کسی شخص کو اچھے لقب سے نوازنا اس کے لیے خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ یہ صورت پہلی ذکر کردہ صورتوں میں سے مستثنیٰ ہے۔ سیرت طیبہ سے ایسے بہت سارے واقعات ملتے ہیں کہ نبی ﷺ نے بعض صحابہ کرام کو بہت اچھے اچھے القابات سے نوازا ہے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے ''صدیق'' جیسے عظیم لقب سے نوازا۔ اسی طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو ''فاروق'' کے لقب سے نوازا۔ سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ''سیف اللہ'' جیسے عظیم لقب سے سرفراز فرمایا اور سیدنا خزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کو ''ذوالشھادتین'' قرار دیا۔

پالتو جانوروں کا نام رکھنا

نام رکھنے سے متعلقہ بحث کے ضمن میں قارئین کی دلچسپی کے لیے ہم یہ بات بیان کرنا بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ شرعاً پالتو جانوروں کا نام رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یعنی اگر کسی شخص نے کوئی گھوڑا، گدھا، اونٹ یا کوئی اور جانور پالا ہوا ہے تو اس کا بھی کوئی نام رکھا جا سکتا ہے۔ البتہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اس نام میں کوئی شرعی قباحت نہ پائی جاتی ہو۔ احادیث میں ہمیں ایسی بیشتر مثالیں ملتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے گھوڑے کا نام ''لُحیف'' تھا۔(صحیح البخاري: 2855) سیدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا بڑا اعلیٰ نسل کا ایک تیز ترین گھوڑا تھا، اس کا نام انھوں نے ''مندوب'' رکھا ہوا تھا۔ (صحیح البخاري: 2862) سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے اپنے گھوڑے کا نام ''جَرَادہ'' رکھا ہوا تھا۔(صحیح البخاری: 2854) رسول اللہ ﷺ کی ایک اونٹنی کا نام ''قصواء'' اور ایک کا نام ''عضباء'' تھا۔ (صحیح البخاري: 2732,2871) آپ ﷺ کے پاس سواری کے لیے ایک گدھا بھی تھا۔ اس گدھے کو ''عُفیر'' کہا جاتا تھا۔ (صحیح البخاري: 2856)

محمد ارسلان حجازی



علم کی ناقدری نے ہمیں بے وقار قوم بنا دیا

ڈاکٹر تحسین فراقی (ڈائریکٹر مجلس ترقی اردو ادب) کا انٹرویو

ضیائے حدیث آپ نے تعلیم کہاں کہاں سے حاصل کی اور کہاں کہاں خدمات انجام دیں؟

ڈاکٹر صاحب میں نے پنجاب پاکستان کے مختلف اداروں سے تعلیم حاصل کی۔ اسکول کی تعلیم بصیر پور (ضلع اوکاڑہ) کے ہائی سکول سے حاصل کی پھر لاہور چلا آیا۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ بی۔ اے کے لیے اسلامیہ کالج سول لائنز میں داخلہ لیا مگر مالی مشکلات کے سبب تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کا پرائیویٹ امتحان دیا۔ اعلیٰ فرسٹ ڈویژن میں بی۔ اے کیا۔ پھر سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی ایڈ کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ بی ایڈ کرنے کے بعد لیہ کے میونسپل کمیٹی کے ہائی سکول میں چند ماہ سینیئر انگلش ٹیچر کے طور پر فرائض سر انجام دیے، پھر دوبارہ لاہور آ گیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو کا امتحان بھی پرائیویٹ طالب علم کے طور پر دیا اور اعلیٰ فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ تقریباً ایک برس پائلٹ سکول شرقپور میں سینیئر انگلش ٹیچر کے طور پر تدریسی فرائض انجام دیے۔ اسی دوران پنجاب یونیورسٹی کے علمی ادارے IER سے شام کی کلاسوں میں تعلیم حاصل کر کے ماسٹر آف ایجوکیشن کا امتحان اعلیٰ نمبروں میں پاس کیا۔

پھر پنجاب پبلک سروس کمیشن سے بطور لیکچرار اردو انتخاب ہوا۔ اس سال اردو کے سیکڑوں امیدواروں نے انٹرویو دیا تھا۔ میں ان سب میں اول آیا تھا، چنانچہ میرا تقرر گورنمنٹ ایم اے او کالج لاہور میں ہوا۔ تقریباً آٹھ برس وہاں اردو کی تدریس کی۔ انھی دنوں پنجاب یونیورسٹی نے اردو لیکچرار کے لیے اسامی مشتہر کی اور میں منتخب ہو کر یونیورسٹی اورنٹیل کالج سے وابستہ ہوا، میں سمجھتا ہوں کہ یونیورسٹی اورنٹیل کالج سے میری وابستگی میری تدریسی زندگی کا نہایت اہم سنگ میل ثابت ہوئی۔ میں نے یہاں کم از کم چوبیس پچیس برس علمی و تدریسی خدمات انجام دیں۔ یونیورسٹی سے وابستگی کے کم و بیش دو برس بعد 1986ء میں مَیں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے احوال و آثار پر ڈاکٹریٹ کی سند لی۔ 2005ء میں مرکزی وزارت تعلیم پاکستان نے تہران یونیورسٹی کے دانش کدۂ ادبیات اور زبانہائے خارجی کے شعبہ اردو کے لیے میرا انتخاب کیا اور میں اردو مسند پر فائز ہو کر تین سال تک وہاں اردو، مطالعاتِ پاکستان اور اقبالیات پڑھاتا رہا۔ تہران یونیورسٹی میں اردو کے شعبے کو مستحکم کرنے میں اپنی خدمات پر اگر میں تھوڑا سا افتخار کروں تو بے جا نہ ہوگا۔ انھی خدمات کا نتیجہ ہے کہ آج وہاں متعدد طالب علم اردو میں ایم۔ اے کر رہے ہیں۔ تین ایرانی اساتذہ محمد کیومرثی، علی بیات اور خانم وفا یزدان منش نے میری نگرانی میں پنجاب یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا اور اب تہران یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ میں گاہے گاہے لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (LUMS) کے شعبہ علوم



انسانی وعمرانی میں بھی اقبالیات کی تدریس کی خدمت بجا لاتا رہتا ہوں۔ اسی یونیورسٹی نے جب رومی، اقبال، غالب اور کلاسیکی اردو شاعری پر حلقہ دانش کے تحت محاضرات کا اہتمام کیا تو میں نے وہاں متعدد لیکچر دیے۔ ان موضوعات پر محاضرات کے دوران حاضرین کی تعداد قابل رشک حد تک ہوتی تھی۔ ہال بھرا ہوتا تھا اور حاضرین کا ذوق وشوق قابل داد! مختصر یہ کہ مجھے تدریس سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے، لفظ سے محبت میرے خمیر میں داخل ہے۔ میرے والد مکرم اوراساتذہ نے میری تہذیب وتربیت میں نہایت بنیادی کردار ادا کیا۔ اخلاص اور علم کے ان روشن میناروں کے حضور میرا سر نیاز ہمیشہ خم رہے گا۔

ضیائے حدیث حصول تعلیم کے لیے آپ کو کن مشکلات سے گزرنا پڑا۔

ڈاکٹر صاحب پاکستان کے سرمایہ دارانہ معاشرے میں متوسط گھرانوں کے طالب علموں کو جن جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، میں نے بھی ان کا سامنا کیا۔ ان میں مالی مشکلات سرفہرست آتی ہیں۔ میرے والد سکول ٹیچر تھے، تنخواہ کم تھی، اخراجات زیادہ، لہٰذا بی۔ اے کی تعلیم اسلامیہ کالج سول لائنز میں چند ماہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ پرائیویٹ امتحان دینا پڑا۔ کتابوں کے حصول میں دقت کا سامنا رہا۔ فیس کی مشکلات رہیں۔ تاہم اپنے دو عزیز بھائیوں کی مالی معاونت سے تعلیم کے مراحل بہرحال طے ہو گئے۔

ضیائے حدیث آپ آج اور نصف صدی پہلے کے طالب علم میں کیا فرق پاتے ہیں؟

ڈاکٹر صاحب مجھے نصف صدی پہلے اور آج کے طالب علم میں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ نصف صدی پہلے کے طالب علم میں بڑی حد تک حصول علم کا جذبہ موجزن رہتا تھا۔ ایسا نہیں کہ اس زمانے میں تحصیل علم کے شارٹ کٹ ذرائع نہ تھے۔ اس زمانے میں بھی گیٹ تھرو گائیڈیں، شیٹ پیپر اور گیس پیپر وغیرہ ہوتے تھے۔ طلبہ کی ایک تعداد بہرحال ان ذرائع پر تکیہ کرتی تھی مگر چونکہ اس زمانے میں ابھی ہمارا نظام تعلیم آج کی طرح مضمحل اور مفلوج نہیں ہوا تھا، تعلیم وتدریس سے وابستہ افراد میں ابھی ہوسِ زر نے پاگل پن کی حد تک گھر نہیں کیا تھا، احساس فرض باقی تھا اوراساتذہ کی ایک بڑی تعداد نہایت درجہ فرض شناس تھی اوراپنے منصب کو پیغمبرانہ منصب خیال کرتی تھی، نیز مدارس میں سالانہ معائنہ ٹیمیں آتی تھیں اور تعلیمی کارکردگی کا کڑا محاسبہ کرتی تھیں، لہٰذا احساس فرض اور خوف احتساب نے باہم مل کر اس نظام کو فعال بنا رکھا تھا۔ اساتذہ طلبہ کو محنت سے پڑھاتے تھے، ان کی زبان کی اصلاح کرتے تھے۔ ان کے طور طریقوں اور طرزِ اعمال پر نگاہ رکھتے تھے، ان کی تادیب اور فہمائش کرتے تھے، نتیجتاً طلبہ بھی اپنے علم و اخلاق کے باب میں حساس اور باشعور تھے، وقت کا بڑا حصہ حصول علم میں صرف کرتے تھے۔ آج صورت حال بہت کچھ بدل گئی ہے۔ علم نے کاروبار کی شکل اختیار کر لی ہے۔ علم کبھی نور تھا، اب یہ بازاروں میں بکتا ہے۔ علم کے نام پر بھانت بھانت کے ادارے اور قسما قسم بیوپاری نت نئی شکلوں میں ظہور کرتے ہیں اور شعبدہ بازیاں کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ علم کے حصول کے حیران کن نئے وسائل منصۂ شہود پر آ چکے ہیں۔ دنیا بھر کے کتب خانے تیزی سے ایک دوسرے سے جڑ رہے ہیں۔ کتاب اور تحریری لوازمات کا حصول نہایت آسان ہو گیا ہے۔ انٹرنیٹ نے طلب علم کو حد درجہ آسان اور علم کو طالب علم کی دہلیز پر پہنچا دیا ہے مگر بدقسمتی سے اسی نیٹ (اور موبائل فون) کے بے حد غلط استعمال نے طرح طرح کے اخلاقی مفاسد کو جنم دے ڈالا ہے۔ گھروں کے اندر الگ الگ جزیرے بلکہ غار بن گئے ہیں جہاں طلبہ ''حصول علم'' کے لیے گوشہ نشیں رہتے ہیں۔ اہل خانہ اور والدین سے ان کا ربط ضبط تیزی سے کم ہو رہا ہے، چونکہ علم مارکیٹ کی ''شے'' بن گئی ہے جسے بیچا اور خریدا جا سکتا ہے، لہٰذا اساتذہ اور بڑوں کا احترام تیزی سے مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ احترام کے اس سریع فقدان کے نتیجے میں علم سے برکت اٹھ گئی ہے، وہ الوہی برکت جس سے سینوں میں چراغ جلتے ہیں اور روحوں کو سرشاری ملتی ہے۔

ضیائے حدیث آپ کے خیال میں ہمارے نظام تعلیم کا بنیادی مسئلہ کیا؟

ڈاکٹر صاحب میرے نزدیک ہمارے نظام تعلیم میں بنیادی خرابی یہ ہے کہ ایک بے ہدف نظام تعلیم ہے۔ نظام تعلیم کی اصلاح کے نام پر کئی کمیشن بنے مگر پرنالا وہیں رہا۔ تعلیم کا بنیادی مقصد افراد قوم میں تہذیب، شائستگی، حلم، وقار،



غیرت، دردمندی، حب وطن، انسان دوستی، وسعت نظر اور رواداری پیدا کرنا اور اس کے دوش بدوش ان میں سچی علمی پیاس اور تازہ بہ تازہ حقائق کی جستجو بیدار کرنا ہے۔ ہمارا نظام و نصاب تعلیم، ان مثبت اہداف سے بہ مراتب دور ہے۔ سچا علم مربوط و منظم شخصیت پیدا کرتا ہے جو وحدت فکر کو پروان چڑھاتا ہے مگر ہمارے ملک میں اس وقت بھانت بھانت کے نظام تعلیم برسرکار ہیں۔ اولیول، اے لیول ادارے، گریمر اسکول، بیکن ہاؤس، رنگا رنگ کے انگلش میڈیم اسکول، غزالی فاؤنڈیشن، دارارقم، فوجی فاؤنڈیشن اسکول، عیسائی مشنری ادارے، ایچی سن اسکول اور کالج وغیرہ۔ ایسے باہم متصادم فلسفہ تعلیم کے حامل اداروں سے نکلنے والے افراد ایک واحد قوم، ایک مربوط ملت کی ضمانت کیسے مہیا کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اب بغیر کسی تاخیر کے مرکزی حکومت کی وزارت تعلیم کو پورے ملک کے سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی اداروں کو قومی اہداف کا واضح شعور دے کر انھیں پابند کرنا چاہیے کہ مثبت اسلامی اقدار، قومی زبان اردو اور دینی اور ملی شعائر کی ترویج و اشاعت کو اپنی علمی سرگرمیوں کی بنیاد بنائیں اور اس ضمن میں کسی مداہنت کا ثبوت نہ دیں۔ ملحدانہ، سیکولر اور مادہ پرستانہ طرز فکر کے بالمقابل خدا پرستانہ، حال آگاہ، مستقبل شناس روحانی طرز احساس ہی پاکستان کے روشن اور پائیدار مستقبل کی ضمانت دے سکتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو ہم اسی طرح ایک بے وقار قوم کی حیثیت سے اس زمین کا بوجھ بنے رہیں گے۔

ضیائے حدیث طبقاتی نظام تعلیم نے ہمارے معاشرے کو کس دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے؟

ڈاکٹر صاحب طبقاتی نظام تعلیم کے نتیجے میں ہمارے معاشرے کے ساتھ پہلا حادثہ یہ ہوا ہے کہ حاکم و محکوم میں وسیع خلیج حائل ہوگئی ہے۔ ایچی سن اسکول و کالج کی قبیل کے اداروں سے انگریزی زبان و آداب کی تعلیم پانے والے ٹاٹ اسکولوں سے تعلیم پانے والے طلبہ کے گویا پیدائشی حاکم قرار پاتے ہیں۔ ان کی خوئے حاکمیت، فراعنہ کے استکبار سے کسی درجے میں کم نہیں۔ ان حاکم طبقوں کے مراکزِ عقیدت مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے بجائے مغرب کے مراکزِ استعمار ہیں، چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ ہمارا حاکم جاگیر دار و سرمایہ دار طبقہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کی قُلی ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ یہی قلی ہمارا حاکم ہے جس کی ڈور مغرب کے استعمار کے ہاتھ میں ہے۔ آپ اسلام کے دور عروج میں مسلم نظام تعلیم و تربیت میں یہ دوئی کہیں نہیں پائیں گے۔ معاشرے کے سارے طبقات ایک ہی نظام کے فیض یافتہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام تعلیم سے بیک وقت معلم، محدث، فقیہ، فلسفی اور ماہرین علوم عقلیہ و عملیہ پیدا ہو رہے تھے۔

ضیائے حدیث سائنس پر حد سے زیادہ دیے جانے والے زور اور دینی، ادبی اور سماجی علوم کو نظر انداز کرنے کا رویہ ہمیں کس مقام پر پہنچائے گا جبکہ اب ذہین طلبہ اس جانب نہیں آ رہے؟

ڈاکٹر صاحب دیکھیے، مسلم ثقافت میں علوم عمرانی و ادبی اور علوم عقلی دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ دنیا کے اکثر ممالک میں ادبی و سماجی علوم پر سائنسی علوم غلبہ پا رہے ہیں، تعلیمی مفکرین کے لیے یہ بجا طور پر باعث تشویش ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ اس غلبے کے نتیجے میں دنیا اس توازن سے محروم ہو گئی ہے جو انسانی اور سماجی علوم کو یکساں اہمیت دینے کے باعث معاشروں میں قائم تھا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی پر حد درجہ اصرار کرنے والے بڑی بھول میں ہیں۔ اس حد درجہ اصرار کے باعث آج طرح طرح کے ذہنی، روحانی اور جسمانی عوارض پیدا ہو رہے ہیں۔ آبی حیات کے لیے شدید مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ اوزون کی تہہ جگہ جگہ سے پھٹ گئی ہے۔

ماحولیاتی آلودگی نے شدید حیاتیاتی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں۔ گلوبل وارمنگ سے گلیشیئر پگھلنا شروع ہو گئے ہیں، شدید طوفان اور سیلاب آ رہے ہیں۔ شاہراہیں روز بہ روز تنگ ہو رہی ہیں۔ دوسری قوموں کے وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے فتنہ گر سامراج نئے نئے حیلے اور ہتھیار تراش رہا ہے۔ سائنس کے برعکس ادبی اور سماجی علوم انسان اور احترام انسانیت کے منادا اور علمبردار ہیں۔ لطیف انسانی محسوسات کے درّاک ہیں اور ہر طرح کی حیاتیاتی زندگی کے احترام کے اصول پر قائم ہیں۔ آج سائنس مریخ کی تسخیر کر رہی ہے۔ ناسا کو اربوں ڈالر کا بجٹ تسخیر سیارگاں کے لیے مختص کیا گیا ہے لیکن کیا اس بات پر کوئی ضمانت ہے کہ مریخ اور دیگر سیاروں کی تسخیر اس دھرتی کے لیے کسی ناقابل تلافی آفت کا باعث نہ بن جائے گی؟ یہ بات معلوم ہے کہ دوسرے



ممالک کے ایٹمی پروگراموں کے شدید ناقد ''امریکہ'' کے پاس مہلک ایٹمی اسلحے کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ اس بدقسمت دھرتی کو پچاس بار تباہ کیا جاسکتا ہے۔ آخر یہ قول کسی سائنس والے کا تو نہیں تھا جس نے کم وبیش سات سو برس پہلے شاید آج کے انھی ''تسخیر کاروں'' کو مخاطب کر کے کہا تھا:

تو کار زمیں را نکو ساختی

کہ باآسمان نیز پرداختی

''کیا تو نے زمین کے سارے مسئلے حل کر ڈالے کہ اب تیری توجہ آسمانوں کی جانب بھی ہونے لگی؟''

اگر سائنس اور ٹیکنالوجی کو اس کی جائز حدود میں رکھنے کی بجائے اسے بے لگام تگ و تاز کے لیے چھوٹ دی گئی تو یاد رکھنا چاہیے کہ اس دھرتی پر ادب، شعر، فنون عالیہ اور علوم عمرانی کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دنیا کے سیاسی بزرجمہروں کو باور کرایا جائے کہ دنیا میں پائیدار امن، توازن اور استحکام کے لیے ادب، مذہبیات اور سماجی علوم کا وجود کس قدر ضروری ہے۔ میرے اس موقف کا مطلب یہ نہیں کہ سائنس کے کارنامے اور اس کے سارے اکتشافات قابل توجہ نہیں، سائنس کی مثبت خدمات کا کون منکر ہوسکتا ہے، مقصد صرف یہ ہے کہ سائنس کے حدود کو متوازن اور متعین کیا جائے۔

ضیائے حدیث دینی مدارس کے نظام تعلیم کے کن پہلوؤں کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے؟

ڈاکٹر صاحب زمانۂ حال کے درد مند علماء اس بات کو شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ دینی مدارس کے نصاب ونظام تعلیم میں بعض تبدیلیاں ناگزیر ہیں، جناب ملا نظام الدین سہالوجی فرنگی محلی (متوفی 1748ء) نے جب اٹھارھویں صدی کے اوائل میں وہ نصاب مرتب کیا جو بعد ازاں درس نظامی کے نام سے مشہور ومقبول ہوا تو برعظیم میں عقلی علوم میں ہونے والی ترقیوں کو پیش نظر رکھ کر اور دیگر مسلم علوم کے دوش بدوش یہ نصاب مدون کیا۔ اس نصاب میں صرف ونحو اور منطق کی کتابوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی اور اس کے بعد فلکیات اور ریاضیات کا نمبر آتا تھا، علاوہ ازیں حدیث، تفسیر، فقہ، کلام اور فلسفہ بھی اس میں شامل تھے، اپنے وقت کے لحاظ سے یہ قابل داد نصاب تھا مگر آج اس کا ایک حصہ بہرحال متروکات میں آتا ہے، اس زمانے کی منطق اور فلسفہ نیز فلکیات و ریاضیات نئے اور معاصر علمی اکتشافات کی روشنی میں بے حد قابل ترمیم ٹھہرتے ہیں، لہٰذا آج دینی مدارس میں یہ نصاب ناگزیر تبدیلیوں کے بعد ہی کار آمد ہوسکتا ہے۔ علاوہ ازیں اکیسویں صدی کے علمی تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا ہے تو انھیں اپنے لازمی نصابات میں بعض اختیاری اور تخصیصی مضامین، مثلاً: معاشیات ، جدید بینکاری اور کمپیوٹر تعلیم کو شامل کرنا ہوگا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے نصابات میں مذاہب عالم کے تقابلی مطالعے کا مبحث لازماً شامل کرنا چاہیے۔ آج جب دنیا تیزی سے ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہو رہی ہے، یہ ضروری ہے کہ ہمارے اہل مدرسہ بھی انگڑائی لے کر بیدار ہوں اور نئے علوم سیکھیں، زبانوں کے بارے میں مہارت تامہ کے علاوہ انگریزی زبان کا سیکھنا بھی ناگزیر ہے کیونکہ آج یہ عالمی علمی زبان ہے۔

ایک اور نہایت اہم پہلو دینی مدارس سے تیار کردہ خطیب ہیں، ان خُطَباء کو نہ صرف اردو زبان پر قابل لحاظ دسترس ہونی چاہیے بلکہ ان کے اسلوب خطابت کو بھی تبدیل کرنا چاہیے، خطابت کو جھلاہٹ اور جوش کے بجائے نرم لہجے، موزوں اور شیریں کلامی سے لیس ہونا چاہیے۔ خطباء کو اندازہ ہی نہیں ہو پایا کہ ان کائے اور لنک کے ساتھ خطاب کا، جس میں کہیں کہیں انڈین گانوں کی طرز پر گائی گئی نعتوں کو بھی شامل رکھا جاتا ہے، جدید زمانے کے تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں پر کتنا منفی اثر ہو رہا ہے۔

ضیائے حدیث کیا آپ آج کے استاد کی تدریسی ذمہ داریوں اور کردار سے مطمئن ہیں؟

ڈاکٹر صاحب ہرگز نہیں، آج کے اساتذہ اس جامعیت سے عاری ہیں جو عہد وسطیٰ کے مسلم معلمین کا طرۂ امتیاز تھی الا ماشاء اللہ۔ مدارس اور کلیات نیز یونیورسٹیوں میں اساتذہ کی عمومی تدریسی صورتِ حال بڑی مایوس کن ہے۔ میں ملک کی ایک بڑی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہا ہوں اور یونیورسٹی کے زبان کے دیگر شعبوں اور سماجی اور بشری علوم کے بعض شعبوں سے ذاتی آگہی رکھتا ہوں۔ میں نے بہت کم اساتذہ کو اپنے مضامین میں طاق پایا،



بہت سے سالہا سال کے بنائے فرسودہ نوٹس سے کام چلاتے ہیں۔ جدید علمی مباحث سے بے خبر ہیں۔ یونیورسٹی لائبریری اکثر اساتذہ کی راہ دیکھتی ہے مگر اساتذہ کو کتاب کی محبت اپنی طرف نہیں کھینچتی۔ زبان کے اساتذہ، زبان کے رموز و اسرار سے بے خبر اور بے اعتناء ہیں۔ اضافی انکری منٹوں، مالیاتی مفادات، اتھلی کتاب سازی، عہدہ طلبی اور ذاتی فائدوں کی موش دوڑ (Rat Race) نے ؎

اتنا دوڑایا لنگوٹی کردیا پتلون کو

والی صورت حال پیدا کردی ہے۔ بعض اساتذہ طلبہ کو اپنے لیکچر کے دوران بولنے نہیں دیتے۔ ان کے سوالات کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ کلاس میں حاضری کے بعد لیکچر دینے کے بجائے انھیں نوٹس ڈکٹیٹ کرا دیتے ہیں۔ کلاسیں وقت پر نہیں لیتے۔ احساس ذمہ داری، درد مندی، علم کی سچی پیاس اور وسیع النظری سے عاری ایسے اساتذہ، استاد کے منصب پر کیسے فائز ہوگئے اور پھر ترقی کرتے کرتے بڑی پوزیشنوں پر کیسے پہنچ گئے؟ یہ سب بہت چبھتے ہوئے سوال ہیں جو اپنے جواب مانگتے ہیں۔

ضیائے حدیث آپ کے نزدیک استاد کی علمی قابلیت کے ساتھ اس کے شخصی کردار کی کیا اہمیت ہے؟

ڈاکٹر صاحب استاد کے لیے یہ دونوں خصوصیات لازم و ملزوم ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ استاد اپنے شاگردوں کے لیے ایک منارۂ ہدایت ہوتا ہے۔ شاگردوں کی اخاذ طبیعتیں اساتذہ کے تلفظ، لہجے، انداز تخاطب، طرز گفتار، طرزِ عمل، چال ڈھال اور کردار سب سے اثر لیتی ہیں، اس لیے استاد کو محکم علم کے ساتھ صلابت کردار کا حامل بھی ہونا چاہیے۔ اسی سے وہ شمشیر جوہر دار وجود میں آتی ہے جو ابطال باطل بھی کرتی ہے اور احقاقِ حق بھی!

ضیائے حدیث کیا پاکستانی جامعات واقعی سماجی و ادبی علوم میں تحقیق کے لیے کوئی بڑا کردار ادا کر رہی ہیں۔ اگر کوئی خرابی ہے تو کہاں ہے اور اس کا حل کیا ہے؟

ڈاکٹر صاحب اردو کے ممتاز محقق رشید حسن خاں مرحوم کا قول تھا کہ تحقیق شرک گوارا نہیں کرتی۔ مراد یہ ہے کہ تحقیق ایک کل وقتی علمی سرگرمی ہے۔ سماجی و ادبی علوم ہی کیا سائنسی علوم کے لیے بھی کسی بڑے کردار کی ضمانت اس وقت تک نہیں دی جاسکتی جب تک ان شعبوں سے وابستہ لوگ شبانہ روز محنت اور ریاضت نہیں کرتے۔ بڑے ادبی، علمی، عمرانی اور سائنسی شاہکار، متجسس روحوں اور انتھک محققوں کی صبح و مسا ریاضتوں کا ثمر ہیں۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ کیا پاکستانی جامعات سماجی و ادبی علوم میں بڑا کردار ادا کر رہی ہیں تو اس کا زیادہ تر جواب نفی میں ہے۔ سالہا سال بعد کوئی ایک آدھ خوش بخت تحقیقی موتی رول لے تو رول لے، زیادہ تر معمولی نوعیت کے کام ہو رہے ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں پورے ملک میں دھڑا دھڑ یونیورسٹیوں کا جال بچھا دیا گیا ہے۔ تعداد پر جائیں تو قابل داد مگر معیار پر جائیں تو لائق افسوس۔ جب سے پی، ایچ، ڈی کے ساتھ مالی منفعت کا دُم چھلا لگا دیا گیا ہے، بہت سے بوالہوس اس میدان میں کود پڑے ہیں، کچے پکے، ادھ کچرے موضوعات پر پی، ایچ، ڈی کے مقالات کے ڈھیر لگتے جارہے ہیں۔ بہت سے موضوعات تکراری ہیں۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن جیسا اربوں کا بجٹ رکھنے والا ادارہ ابھی تک اتنی توفیق بھی حاصل نہیں کر پایا کہ یونیورسٹیوں کے شعبوں کو تحقیقی موضوعات کی تکرار ہی سے بچا سکے۔ جس موضوع کی بھی ایڈوانسڈ ریسرچ بورڈ سے منظوری ہوجائے اور بعد ازاں اس پر اچھا برا مقالہ جمع کرا دیا جائے تو پی، ایچ، ڈی کی ننانوے اعشاریہ نو فیصد ضمانت دی جاسکتی ہے۔ من پسند ممتحنوں کے تقرر کے بعد ان سے مقالے کے حق میں رائے لینا زیادہ تر معمول بن گیا ہے۔ ادبی علوم کے شعبوں کے ساتھ لسانیات کا بطور مضمون وجود تقریباً ناپید ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ادبی محققوں کی لسانیاتی تربیت ہی نہیں ہو پاتی۔ مخطوطوں کی تدوین اول تو ہو ہی نہیں رہی، ہو بھی تو ان قلمی نسخوں کو ایسے لوگ ایڈٹ کرتے ہیں جو تحقیق کی مبادیات سے بھی آگاہ نہیں ہوتے۔ کلاسیکی ادب و شعر کی قراءت ایک نہایت مشکل کام ہے اور وسیع لسانی پس منظر کا متقاضی ہے۔ یہ وسیع لسانی پس منظر عموماً عنقاء ہے۔ ادب ہی کیا ہمارے تاریخ کے شعبوں سے وابستہ اساتذہ فارسی زبان سے نابلد ہیں جبکہ برعظیم کے سلاطین اور مغلوں کے عہد کی بیشتر تاریخیں فارسی میں ہیں۔ محقق بنیادی مآخذ کے بجائے ثانوی مآخذ کا سہارا لیتا ہے، نتیجہ پامال اور



فرسودہ باتوں کی صورت میں نکلتا ہے۔ ہماری کلاسیکی نثر کی تفہیم بھی فارسی، عربی اور کسی قدر ہندی یا دکنی جانے بغیر ممکن نہیں۔

میرے خیال میں دھڑا دھڑ پی، ایچ، ڈی کی دکانیں کھولنے کے بجائے اس عمل کو محدود کر کے صرف ان لوگوں کو اس کا موقع ملنا چاہیے جو واقعی اس کے لیے موزونی اور مناسبت رکھتے ہیں۔ شعبوں میں وسیع لسانی پس منظر رکھنے والے فرض شناس اساتذہ کا تقرر ضروری ہے جو طلبہ کی صحیح خطوط پر تحقیقی تربیت کر سکیں۔ ان میں تحسین ادب وفن کا سچا ذوق پیدا کر سکیں۔ انھیں محنت اور ریاضت کا خوگر بنا سکیں، انھیں باور کرا سکیں کہ خوش گلو اور خوش الحان پرندہ محض اس لیے گاتا ہے کہ گانا اس کے خمیر میں داخل ہے، وہ ''نان ونمک'' کے لیے نہیں گاتا! پاکستانی جامعات میں تقابلی ادبیات کا مطالعہ بہت ضروری ہے تاکہ قوموں کے مابین مشترک طرز احساس کے کھوج لگانے سے کثرت کے بجائے وحدت اور دوئی اور دوگانگی کے بجائے اتحاد وانسجام کا احساس جنم لے سکے جو تشتت اور تفریق سے اٹے ہوئے ہمارے اس عہد نافرجام کے لیے نہایت لازمی ہے۔

ضیائے حدیث پی، ایچ، ڈی کے مقالے کے لیے آپ نے مولانا عبدالماجد دریا بادی ہی کی شخصیت کا انتخاب کیوں کیا؟

ڈاکٹر صاحب دراصل اردو ادب کے صاحب اسلوب کے حوالے سے دو شخصیات میرے ذہن میں تھیں جن میں سے کسی ایک پر میرا ارادہ ڈاکٹریٹ کرنے کا تھا، یعنی رشید احمد صدیقی یا عبدالماجد دریا بادی۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے اس وقت کے صدر جناب ڈاکٹر وحید قریشی کو اول الذکر موضوع سے اس لیے اتفاق نہ ہوا کہ ان پر پی ایچ ڈی برعظیم کی کسی یونیورسٹی سے ہو رہی تھی، چنانچہ مجھے دوسرے موضوع پر پی، ایچ، ڈی کی اجازت دی گئی۔ دراصل مولانا دریا بادی کی شخصیت کے پہلو اس قدر کثیر تھے کہ میں ان کے ساتھ ایک طبعی ہم آہنگی محسوس کر رہا تھا، وہ اردو کے صاحب طرز ادیب تھے، فلسفہ ونفسیات میں پروئے ہوئے، نامور، حق گو، بے باک اور طرح دار صحافی، انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر حیرت انگیز قدرت رکھنے والے، عربی زبان کے ماہر اور رمز شناس اور قرآنیات اور مذاہب عالم پر نہایت وسیع نظر رکھنے والے عالم اور مفسر اس پر مستزاد یہ کہ شاعر، ڈرامہ نگار، مترجم اور مدون۔ میں نے ان کی تمام جہتوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی، میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میں نے مولانا دریا بادی کو تحقیق کے لیے چنا، اس انتخاب کے نتیجے میں فلسفہ و نفسیات، تفاسیر اور تاریخی وتہذیبی موضوعات پر میں نے زیادہ گہرائی میں جا کر مطالعہ کیا، میرے اندر بین العلومی مطالعات کا رجحان پیدا ہوا اور مجھے وسعت نظر میسر آئی۔

ضیائے حدیث مولانا عبدالماجد دریا بادی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے درمیان کس قسم کے علمی اختلاف رہے ہیں؟

ڈاکٹر صاحب مولانا دریا بادی اور مولانا آزاد دونوں اپنے اپنے دائرے میں بے مثال ہیں، مولانا دریا بادی عمر میں مولانا آزاد سے چند برس چھوٹے تھے۔ دونوں کے مابین بیشتر محبت اور باہمی احترام کا رشتہ رہا۔ اس کے مظہران کے وہ مضامین ہیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً مولانا آزاد کی شخصیت پر لکھے اور جنھیں ''اردو کا ادیب اعظم'' (یہ عنوان بھی آزاد پر اپنے ایک مختصر مضمون میں خود مولانا دریا بادی نے قائم کیا تھا) کے زیر عنوان ڈاکٹر ابوسلیمان شاہ جہانپوری نے (1986ء میں) شائع کر دیا تھا۔ البتہ یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں ہفت روزہ ''الہلال'' کی اشاعت کے کچھ عرصے بعد جب ایک مرحلے پر مولانا دریا بادی نے ''مفردات جذبات'' کے عنوان سے علم النفس پر ایک تحریر الہلال میں شائع کی تو دو انگریزی اصطلاحات Pain & Pleasure کے لیے انھوں نے ''حظ وکرب'' کی اصطلاحیں استعمال کیں جن سے مولانا آزاد نے اختلاف کرتے ہوئے دو متبادل اصطلاحات ''لذت و الم'' پر اصرار کیا تھا، اس پر دونوں کے مابین ایک طویل علمی بحث چھڑ گئی تھی، جس پر دونوں طرف سے طنزیات کا بھی خوب استعمال رہا اور کئی اہم علمی و اصطلاحاتی نکتے بھی زیر بحث آئے۔ اس قلمی معرکے کے علاوہ طرفین میں اور کوئی بحث کم از کم میرے علم میں نہیں۔ ہاں مولانا آزاد کے طرز سیاست سے اور بہت سے اکابر کی طرح مولانا دریا بادی کو بھی اختلاف رہا، ان کے خیال میں ''الہلال'' کا ابوالکلام جو کبھی ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا علمبردار تھا، برعظیم کی بعد کی سیاسی ہنگامہ آرائی کے زمانے میں ہندوستانی قومیت کی طرف پھر گیا۔ متحدہ قومیت کا تصور مولانا دریا بادی کے فکری نظام نامے میں کبھی جگہ نہ پا سکا، یہ اختلاف اپنی جگہ مگر مولانا دریا بادی مولانا آزاد کی زندۂ جاوید نثر اور ان کے جادو نگار قلم کے ہمیشہ معترف اور



مداح رہے۔

ضیائے حدیث مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کے علمی مقام و مرتبہ میں آپ کیا فرق پاتے ہیں؟

ڈاکٹر صاحب اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا آزاد اور مولانا دریا بادی دونوں بلند پایہ محقق اور مصنف ہیں لیکن اگر دونوں کا تقابل کیا جائے تو اول الذکر کے یہاں عمق اور گہرائی زیادہ ہے اور موخر الذکر کے یہاں وسعت اور تنوع۔ مولانا دریا بادی نے سچ، صدق اور صدق جدید کے ذریعے صحافت میں حق گوئی اور بے باکی کو عام کیا تو ان سے قبل مولانا آزاد نے لسان الصدق، الہلال اور البلاغ کے ذریعے اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ انجام دیا۔ مولانا آزاد کا علمی سرمایہ مولانا دریابادی کے مقابلے میں کمیت میں کم ہے مگر کیفیت میں بمراتب بڑھا ہوا ہے۔ مکمل تفسیر ماجدی کے مقابلے میں ترجمان القرآن اگرچہ نامکمل رہی مگر اپنے تفسیری نکات اور تحقیقی افادات کی بنا پر تفسیر ماجدی سے قد نکالتی نظر آتی ہے۔ ہاں مولانا دریا بادی کی انگریزی تحریروں کے بالمقابل مولانا آزاد کی کوئی طبع زاد انگریزی تحریر نہیں ملتی۔ خوبصورت اور بامحاورہ انگریزی لکھنے میں مولانا دریا بادی، مولانا آزاد پر فائق تھے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ مولانا آزاد نے برعظیم کی آتشیں سیاسیات میں جو ہنگامے برپا کیے وہ مولانا دریا بادی کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتے تھے۔ دریابادی کی گوشہ نشینی کے مقابلے میں آزاد کی مجلس آرائی، سیاسی ہنگامہ پروری، غیر ملکی اسفار اور مشاہیر کے ربط ضبط نے ان کی شخصیت کے گرد ایک ایسا درخشاں ہالہ بُن دیا تھا جو تنہا روی اور گوشہ گیری سے بمراتب دور رہا اور رہتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ شہرت مولانا دریا بادی کا نصیب نہ ہوسکی جو ابوالکلام کے حصے میں آئی۔ آگ دونوں کے اندر تھی مگر اس کا شعلہ جوالہ بننا صرف ابوالکلام کے حصے میں آیا۔ اردو ادب کا مورخ ان دونوں کے علمی کمالات کا معترف ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

ضیائے حدیث پاکستان کے نظام تعلیم میں علامہ اقبال کا کیا مقام ہے اور کیا ہونا چاہیے؟

ڈاکٹر صاحب برعظیم میں اقبال کا ظہور ذات حق کے احسانات میں سے ہے۔ وہ ملت اسلامیہ کے بالعموم اور ملت پاکستان کے عظیم محسن ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ملت کے اس محسن کے ارشادات کی روشنی میں پاکستان کے ارباب حل و عقد اپنی سمت سفر کا تعین کرتے مگر افسوس ایسا نہ ہوسکا۔ ہمارا سیاسی نظام بھی ان کے بصیرت افروز نکات سے کنارہ گر رہا اور ہمارا نظام تعلیم بھی ان کے شعلہ نوا کی قندیل سے محروم نور و نوا رہا۔ ان کے ہمہ گیر فلسفیانہ تصورات خاک کو اکسیر بنا سکتے ہیں بشرطیکہ ان سے اخلاص سے استفادہ کیا جائے۔ بلند نگہی، ستارہ جوئی اور آفتاب شکاری کے سارے گر اقبال کے معجز نگار قلم نے رقم کر دیے ہیں۔ ارباب تعلیم کا فرض ہے کہ وہ اقبال کے حیات آفریں اشعار و افکار سے نصابات کو مزین کریں۔ اولین درجوں سے لے کر کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم تک کو اقبال کے افکار سے بہرہ یاب کریں۔ فکر اقبال صرف انسانی اور سماجی علوم ہی کا نہیں، سائنس کے طلبہ و طالبات کی ہم نصابی سرگرمیوں کا حصہ بھی ہونا چاہیے۔ اگر قوم کے فرزندوں کو اقبال کے توسط سے ایمان، ایقان، سخت کوشی، بلند نگہی، پاکیزہ خیالی، وسعت نظر، اور تسخیر قلوب و افلاک کی نعمت میسر آجائے تو پاکستان کی تقدیر بدل سکتی ہے اور یہ ملک قوموں کی سیادت میں ایک بنیادی اور ہمہ گیر رول ادا کرنے کے قابل ہوسکتا ہے۔

ضیائے حدیث 1973ء کے آئین کے مطابق پندرہ برس کے اندر اردو پاکستان کی دفتری زبان کیوں نہیں بن سکی؟

ڈاکٹر صاحب یہ ایسا سوال ہے جیسے کہا جائے پچیس برس پہلے کا کالا باغ ڈیم منصوبہ حقیقت کا روپ کیوں نہیں دھار سکا؟ سچ پوچھیے تو دونوں کا ایک ہی جواب ہے: ہماری قومی کم نظری اور صوبہ جاتی تعصب۔ اگر اس قوم میں اجتماعی سوچ پیدا ہوجاتی اور ہمیں معلوم ہوجاتا کہ کسی قوم کی ہمہ جہت ترقی میں قومی زبان کا کردار کتنا اہم اور ہمہ گیر ہوتا ہے تو ہم اب تک اس کو اس کا صحیح قومی اور دفتری مقام عطا کر سکتے تھے۔ بدبختی یہ ہے کہ اجتماعی سوچ کے فقدان اور وحدتِ فکر کی عدم موجودگی کے باعث ہم اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ ہمارے

حاکم، مغربی استعمار کے غلام اور ان کے اشارۂ ابرو پر اپنی قومی حمیت کا سودا چکانے پر ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ بدقسمتی سے اردو اور پنجاب کو اس طرح مترادفات کے طور پر برتا جانے لگا ہے گویا اردو کے قومی زبان بن جانے سے پنجاب تمام صوبوں پر غلبہ حاصل کرلے گا۔ اہل پنجاب کے اردو سے غیر معمولی عشق میں کوئی کلام نہیں۔ پنجاب کا دارالحکومت لاہور اردو کا سب سے بڑا مرکز ہے مگر یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اردو اہل پنجاب میں سے اکثریت کی مادری زبان نہیں، اس کے باوجود اہل پنجاب اردو کے قومی زبان بنانے کے حق میں ہیں کہ یہ وہ زبان ہے جو پاکستان کے طول وعرض میں واحد سمجھی جانے والی زبان ہے۔ اور جو کسی علاقائی زبان کی حریف نہیں بلکہ حلیف ہے۔ اس کی انتظامی اور دفتری اصطلاحات مدت ہوئی وضع ہوچکی ہیں۔ بہترین کمپیوٹر نستعلیق کا نظام مدت سے وجود میں آچکا ہے۔ خدا کرے کہ قومی دردِ دل رکھنے والی ایسی حکومت وجود میں آئے جو پورے ملک میں اس زبان کا فوری اور حتمی نفاذ کرے۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا ہم آئین سے بے وفائی کے مرتکب ہوتے رہیں گے۔ اس ضمن میں ہمیں اقبال کے اس شعر کو حرزِ جاں بنالینا چاہیے جو آئین و دستور کے منحرفین کے لیے ایک زبردست انتباہ کی حیثیت رکھتا ہے:

دہر میں عیشِ دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہوگئیں



ابوعبداللہ

دارُالسّلام

انعامی کوئز پروگرام

Sh.Siddiq7@Gmail.com

ماہ مارچ کے درست جوابات

① سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ۔ بعد میں یہ لشکر ''جیش اسامہ'' کے نام سے معروف ہوا۔ ② رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان کے مسلمان پر چھ حق ہیں: جب تم اس سے ملو تو سلام کہو، جب دعوت دے تو اس کی دعوت قبول کرو، جب نصیحت طلب کرے تو نصیحت کرو، جب چھینک آنے پر وہ «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ» کہے تو اس کے جواب میں «يَرْحَمُكَ اللّٰهُ» کہو، بیمار ہوجائے تو اس کی عیادت کرو اور جب فوت ہوجائے تو اس کی نماز جنازہ ادا کرو۔ (صحیح مسلم: 2162) ③ مارچ 1940ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے ستائیسویں اجلاس میں قرار داد پاکستان پیش کی گئی۔ ④ قرارداد مقاصد 12 مارچ 1949ء کو مرکزی اسمبلی میں پیش کی گئی۔

بذریعہ قرعہ اندازی 6 ماہ کے لیے فری رسالہ پانے والوں کے نام

محمد بلال شاہین (بہاولنگر)، شعیب رحمٰن (جھنگ)، حافظ شمشاد حمید (خانیوال)، بنت محمد شفیق، صائمہ صدیق، شمائلہ شہباز (فیصل آباد)، محمد ثاقب (ساہیوال)، زین العابدین (سیالکوٹ)، مبشر شیث (قصور)، حافظ اظہر یوسف، سید حسنات الحسن (گوجرانوالہ)، محمد ناصر (پاکپتن)، تعظیم غلام مصطفیٰ۔

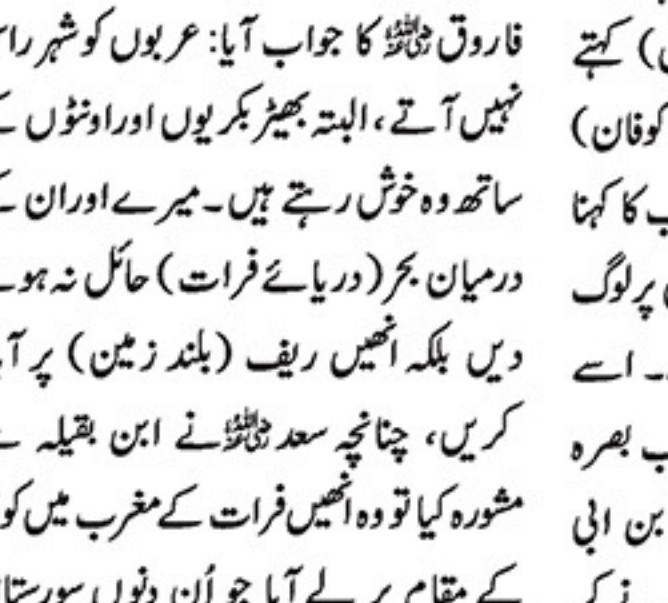
عبارتیں ڈھونڈیں انعام پائیں

① ہم محنت سے جی چراتے ہیں اور ناجائز اور آسان ذرائع سے دولت کے ڈھیر لگانے کے خواہشمند ہیں۔ ② کسی بھی مسلمان کو ''یہودی'' یا ''نصرانی'' کہہ کر پکارنے سے منع کیا گیا ہے۔ ③ میاں شہباز شریف نے انگریزی کی پرستش کے جنون میں پنجاب میں اردو میڈیم ختم کر کے جبراً انگلش میڈیم مسلط کر دیا ہے۔ ④ میری ماؤں سے التجا ہے خدارا اپنی بچیوں پر توجہ دیں۔

بچوں کے لیے انعامی کوئز

① سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دور خلافت کتنے عرصے پر محیط ہے؟ ② حدیث مکمل کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کم عمر شخص بڑے کو سلام کرنے میں پہل کرے.....'' ③ کیا آپ نبی ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں، اگر کرتے ہیں تو کس کتاب سے؟ ④ آپ نے قرآن مجید کی کتنی اور کون کون سی سورتیں زبانی یاد کی ہیں؟

عراق کے تاریخی شہر



محسن فارانی

کوفہ

یاقوت حموی لکھتے ہیں: یہ ارضِ بابل (سوادالعراق) کا مشہور مصر (شہر) ہے۔ کچھ لوگ اسے خذ العذ راء (کنواری کا گال) کہتے ہیں۔اس کا نام ریت کے گول ٹیلے (کوفان) کی نسبت سے کوفہ رکھا گیا۔ جبکہ قطرب کا کہنا ہے کہ کوفہ کا نام ''کوفان'' (وہ امر جس پر لوگ جمع ہوجائیں) کے حوالے سے ہے۔ اسے 17ھ میں، یعنی اسی سال بسایا گیا جب بصرہ آباد ہوا۔ فتح مدائن کے بعد سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے کمانڈر خالد بن عرفطہ نے کر بلا فتح کر کے وہاں کے لوگوں کو قیدی بنا لیا جو سعد رضی اللہ عنہ نے مجاہدین میں تقسیم کر دیے۔ پھر انھوں نے شریکِ لشکر ہر قبیلے کو اس جانب آباد کیا جدھر ان کا قرعہ نکلا۔ اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھ کر اطلاع دی۔ خلیفہ نے جواب لکھا کہ ان کی سکونت بدل دیں، چنانچہ سعد رضی اللہ عنہ نے انھیں سوق حَکَمہ یا عُویفہ ابن عمر منتقل کرنا چاہا تو وہ انکاری ہو گئے۔

شہر کوفہ کی آبادکاری

سعد رضی اللہ عنہ نے پھر مدینہ خط بھیجا تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا جواب آیا: عربوں کو شہر راس نہیں آتے، البتہ بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کے ساتھ وہ خوش رہتے ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان بحر (دریائے فرات) حائل نہ ہونے دیں بلکہ انھیں ریف (بلند زمین) پر آباد کریں، چنانچہ سعد رضی اللہ عنہ نے ابن بقیلہ سے مشورہ کیا تو وہ انھیں فرات کے مغرب میں کوفہ کے مقام پر لے آیا جو اُن دنوں سورستان کہلاتا تھا۔ سعد رضی اللہ عنہ نے قبلے کی جانب تیر چلایا اور جہاں وہ گرا اسے نشان زد کرلیا۔ پھر شمال کی طرف تیر چلایا اور ادھر نشان رکھا۔ پھر مناسب جگہ دارالامارہ اور مسجد کا تعین کیا۔ اس کے بعد بنو نزار اور اہل یمن کے لیے قرعہ ڈالا کہ جس کا نام پہلے نکلے گا، اسے مشرقی جانب آباد کیا جائے گا۔ یوں اہل یمن کو مشرقی جانب آباد کیا اور بنو نزار کو مغربی جانب۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ شروع میں اہل کوفہ کے گھر سرکنڈوں کے تھے۔ جب وہ جہاد کے لیے نکلتے تو اکھاڑ کر کسی کو بطور صدقہ دے دیتے۔ پھر جہاد سے لوٹتے تو دوبارہ گھر کھڑے کر لیتے۔ جہاد میں ان کی خواتین بھی ساتھ رہتیں۔ پھر جب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ گورنر بنے تو قبائل اینٹوں کے مکانات بنانے لگے جو زیادہ اونچے نہیں ہوتے تھے اور نہ ان کے بالاخانے تھے۔ پھر زیاد ابن ابیہ کے عہد میں پختہ اینٹوں کے دروازے بننے لگے اور ایسے دروازے قبائل مراد اور خزرج سے زیادہ کسی کے ہاں نہ تھے۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حکم پر 19ھ میں سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں 40 ہزار انسانوں کے لیے ایک جامع مسجد بنائی۔ زیاد نے اپنے دورِ امارت میں نمازیوں کی گنجائش مزید بیس ہزار تک بڑھا دی۔ اس نے مسجد پختہ اینٹوں سے بنائی اور اہواز سے اس کے لیے ستون منگوائے۔ 264ھ میں کوفہ 6 میل کے طول اور 2 میل کے عرض میں پھیلا ہوا تھا۔ اس میں بنو ربیعہ اور بنو مضر کے پچاس ہزار گھر تھے اور باقی سب عربوں کے گھروں کی تعداد 24 ہزار تھی جن میں چھ ہزار گھر یمنیوں کے تھے۔ جامع مسجد کوفہ ہی میں وہ محراب ہے جس میں عبدالرحمٰن ابن ملجم خارجی نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔

کلبی کہتے ہیں: حجاج بن یوسف (گورنر عراق) خلیفہ عبدالملک بن مروان سے ملنے



دمشق گیا تو اس کے ہمراہ عراقی اشراف بھی تھے۔ حجاج اور خلیفہ نے کوفہ اور بصرہ کا ذکر چھیڑا تو محمد بن عمیر عطاردی کہنے لگا: کوفہ شام اوراس کی وبا کی نسبت سے نچلا اور محفوظ ہے اور بصرہ اوراس کی گرمی سے بلند اور بچا ہوا ہے۔ اس کی زمین صحت بخش اور زرخیز ہے۔ کوفہ سے شمال کو آئیں تو ایک ماہ کی مسافت تک کافور کی خوشبو آتی ہے۔ اور جنوب کی طرف ہمیں سواد عراق اوراس کے گلابوں، یاسمین اور نارنگیوں کی خوشبو آتی رہتی ہے۔ ہمارا پانی میٹھا ہے اور ہماری زندگی ثمر آور ہے۔ حجاج بولا: امیر المومنین! کوفہ ایک ایسی دوشیزہ ہے جس پر کوئی زیور ہے نہ سنگھار مگر بصرہ ایک ایسی بڑھیا ہے جس کے بال کھچڑی ہیں، منہ اور بغلوں سے بو آتی ہے مگر وہ ہر طرح کے زیور سے آراستہ ہے۔'' عبدالملک نے کہا: گویا تم نے کوفہ کو بلند درجہ دیا ہے۔

جامع مسجد کوفہ

کہا جاتا ہے کہ ''جامع مسجد کوفہ کے مقام پر حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نماز پڑھی تھی اور یہیں تنور سے پانی پھوٹا تھا جس نے طوفان نوح کی شکل اختیار کر لی۔ یہاں ایک ہزار نبیوں اوران کے جانشینوں نے نماز پڑھی۔ یہیں وہ درخت یقطین تھا جس سے یونس علیہ السلام کو شفا حاصل ہوئی تھی۔ یہیں یغوث اور یعقوق ہلاک ہوئے.....'' اس بے سروپا شیعی روایت کی کوئی سند نہیں۔ جامع کوفہ کی اصل فضیلت یہ ہے کہ یہ عہدِ صحابہ کی قدیم ترین مسجد ہے جہاں سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ، حسنین رضی اللہ عنہما، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ، سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور نہ جانے کتنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نمازیں پڑھی ہیں۔

خلافتِ فاروقی ہی میں کوفہ اطراف و اکناف میں پھیل گیا تھا۔ یہاں مجاہدین اور نومسلم تو بڑی تعداد میں آباد تھے مگر شروع میں انھیں دین کی تعلیم دینے والی کوئی ایسی شخصیت نہ تھی جو ان کی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو یہاں بھیج کر اہل کوفہ کو لکھا: ''ان کے معاملے میں میں نے تمھیں اپنے پر ترجیح دی ہے۔'' یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ضرورت تو مجھے تھی لیکن تمھاری ضرورت کی بنا پر ایثار کر کے تمھارے پاس بھیج رہا ہوں۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کوفہ کو علم و فضل سے جگمگا دیا۔ ان کے شاگردوں نے ان سے علم حاصل کر کے یہاں اپنے اپنے درس کے حلقے قائم کیے اور یوں کوفہ حرمین شریفین کے بعد علمِ حدیث و فقہ کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ جب خلیفہ رابع سیدنا علی رضی اللہ عنہ کوفہ تشریف لائے تو انھوں نے یہاں علم کا چرچا دیکھ کر فرمایا: اللہ ابن ام عبد (ابن مسعود رضی اللہ عنہ) پر رحم فرمائے۔ انھوں نے اس شہر کو علم سے بھر دیا ہے۔''

ہزاروں محدثین، مفسرین اور فقہاء نے یہاں جامع مسجد کوفہ میں درس دیا۔ پھر کوفہ کے حلقہ ہائے درس نے امام ابوحنیفہ، سفیان ثوری، عبداللہ ابن مبارک، وکیع بن جراح، قاضی ابویوسف، امام محمد شیبانی، عاصم بن کلیب، فلتان بن عاصم جیسے جبالِ علم پیدا کیے جنھوں نے اپنے علم و فضل سے دنیا بھر کو سیراب کیا۔

ایک عبرتناک واقعہ

جامع مسجد کوفہ کی دیوارِ قبلہ کے ساتھ ساتھ ایک قلعہ نما عمارت کے کھنڈر ہیں۔ یہ کوفہ کا دارالامارہ تھا۔ اس کے متعلق ایک عبرتناک واقعہ عبدالملک بن عمیر لیثی نے بیان کیا ہے۔ ایک بار خلیفہ عبدالملک بن مروان اس دارالامارۃ میں موجود تھے۔ عبدالملک بن عمیر نے ان سے کہا: ''امیر المومنین! میں نے یہاں سب سے پہلے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر عبید اللہ بن زیاد کے سامنے ایک ڈھال پر رکھا ہوا دیکھا۔ پھر اسی قصر میں ابن زیاد کا سر کٹا ہوا مختار بن ابی عبید ثقفی کے سامنے دیکھا۔ پھر یہیں مختار کا کٹا ہوا سر مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کے سامنے دیکھا۔ پھر اسی جگہ مصعب کا کٹا ہوا سر آپ کے سامنے دیکھا۔'' عبدالملک بن مروان پر یہ سن کر خوف طاری ہو گیا اور وہ یہاں سے منتقل ہو گئے (تاریخ الخلفاء للسیوطی)۔ دارالامارہ کے دائیں جانب قدیم طرز کا ایک پختہ مکان ہے جو سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے منسوب ہے۔ مسجد کے ایک طرف دو بڑے قبے ہیں۔ ایک قبہ ہانی بن عروہ کا ہے جس نے سفیرِ حسین مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کو پناہ دی تھی۔

کوفہ میں محمد بن علاء بن کریب ہمدانی کوفی معروف حافظِ حدیث تھے۔ انھوں نے یہاں عبداللہ بن مبارک، عبداللہ بن ادریس، حفص بن غیاث اور وکیع بن جراح سے حدیث کی سماعت کی اوران سے محمد بن یحییٰ الذہلی،



عبداللہ بن یحییٰ الذہلی، عبداللہ بن یحییٰ بن حنبل، ابویعلیٰ الموصلی، حسن بن سفیان ثوری، ابوعبداللہ البخاری، مسلم بن الحجاج، ابوداود سجستانی، ابوعیسیٰ ترمذی، ابوعبدالرحمٰن النسائی، ابن ماجہ القزوینی اور ابوعروہ المرائی نے، روایات بیان کیں۔ ابن عقدہ، محمد بن علاء ہمدانی کو حفظ و کثرت حدیث میں تمام مشائخ کوفہ پر فوقیت دیتے تھے۔ انھوں نے جمادی الاولیٰ 243ھ میں وفات پائی اوران کی وصیت کے مطابق ان کی کتابیں ان کے ساتھ دفن کی گئیں۔

سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ''مناسک دین مکہ والوں سے سیکھو، قراءت مدینہ والوں سے سیکھو اور حلال و حرام کا علم اہل کوفہ سے حاصل کرو۔'' یزید الرشک کے بقول: خالد بن عبداللہ القسری کے عہد امارت میں ساٹھ ہزار مجاہدین کوفہ میں بستے تھے جبکہ ان کے اہل و عیال کی تعداد 80 ہزار تھی۔

بغداد

جب مسلمانوں نے عراق فتح کیا تو بغداد کوئی قابلِ ذکر شہر نہ تھا اور ''سوق بغداذ'' کہلاتا تھا۔ کسریٰ نوشیرواں کے زمانے سے دجلہ کے مغربی کنارے پر یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ کہتے ہیں کہ کسریٰ نے ایک بت پرست غلام کو یہ علاقہ بطور جاگیر دیا تھا۔ وہ ''بلغ'' نامی بت کی پوجا کرتا تھا، چنانچہ اس نے کہا: ''بلغ داذ'' یعنی ''یہ جاگیر مجھے بلغ نے دی ہے'' یوں وہ بستی ''بغداذ'' کہلائی۔ اسی لیے عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ اور دیگر علماء اس شہر کو بغداد کہنا پسند نہیں کرتے تھے۔

دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے کوفہ اور حیرہ کے درمیان ''ہاشمیہ'' کے نام سے دارالخلافہ بنایا تھا۔ 141ھ / 758ء کی بات ہے، منصور ہاشمیہ میں اپنے محل میں محوِ استراحت تھا کہ باہر شور سنائی دیا۔ پوچھنے پر اہلکاروں نے بتایا کہ فرقہ راوندیہ کے لوگ محل کا طواف کر رہے ہیں۔ ان کی تعداد دوسو تھی۔ یہ لوگ اصلاً خراسان (ایران) کے تھے اور ابومسلم خراسانی کے پیروکار تھے جسے منصور نے چند سال پہلے جرم بغاوت میں قتل کرا دیا تھا۔ راوندیہ تناسخ کا عقیدہ رکھتے تھے اور معاذ اللہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کا بادشاہ منصور ان کا رب ہے جو انھیں پالتا ہے۔ اب وہ اکٹھے ہوکر بزعمِ خویش اپنے ''رب'' کے محل کا طواف کرنے آ گئے تھے۔ خلیفہ نے ان گمراہ راوندیوں کو قید کر دیا مگر اگلے روز ان کے باقی ساتھی انھیں قید خانے سے چھڑا لے گئے اور پھر وہ خلیفہ کے محل کی طرف بڑھے۔ منصور کو ان کے خطرناک عزائم کا پتہ چلا تو وہ محل سے پیدل نکلا کیونکہ اس وقت کوئی سواری میسر نہ تھی، پھر کوئی اہلکار سواری لایا تو اس نے سوار ہوکر فوج کے ساتھ باغیوں کے مقابلے میں صف بندی کرلی۔ خوب لڑائی ہوئی اور نمازِ ظہر تک بیشتر باغیوں کا صفایا کر دیا گیا۔

ابومسلم خراسانی کے جو پیروکار بچ گئے تھے، ان کے فتنے سے بچنے کے لیے خلیفہ منصور نے سوچا کہ دارالخلافہ کوفے سے دور اور اہل ایران کے نزدیک ہونا چاہیے، چنانچہ اس نے کوفے سے موصل تک مختلف مقامات کا جائزہ لیا اور پھر دجلہ کے کنارے سوقِ بغداد کا انتخاب کیا۔

تب منصور نے کہا: ''اس جگہ کے ایک طرف دجلہ ہے۔ یہاں سے ہمارے اور چین کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہوگی۔ دوسری طرف فرات ہے جہاں سے شام اور رقہ سے رابطہ رہے گا۔''

خلیفہ منصور کا عجب واقعہ

تعمیر بغداد کے سلسلے میں یاقوت حموی نے معجم البلدان میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ علی بن یقطین نے بیان کیا کہ میں ابوجعفر منصور کی فوج میں تھا جب اس نے نہر صراۃ کی طرف سفر کیا۔ خلیفہ کو مدینہ (دارالخلافہ) کے لیے جگہ کی تلاش تھی۔ وہ صراۃ کے کنارے ایک مسیحی خانقاہ کے پاس رُکا اور لوگوں سے الگ ہوکر اپنی سواری پر سوچ بچار کرتے ہوئے کبھی ادھر جاتا کبھی ادھر۔ خانقاہ کے ایک راہب نے مجھ سے کہا: بادشاہ ادھر ادھر کیوں پھر رہا ہے؟ میں نے کہا: وہ شہر آباد کرنا چاہتا ہے۔ پوچھا: اس کا نام کیا ہے؟ میں نے بتایا: عبداللہ بن محمد۔ پوچھا: کنیت کیا ہے؟ میں نے کنیت بتائی: ابوجعفر۔ وہ بولا: کوئی لقب بھی ہے؟ میں نے بتایا: المنصور۔ وہ کہنے لگا: یہ تو شہر نہیں بسائے گا۔ میں نے پوچھا: کیوں؟ بولا: ہمارے پاس صدیوں سے ورثے میں ملنے والی کتاب ہے، اس میں لکھا ہے کہ جو شخص اس جگہ شہر بسائے گا اس کا نام مقلاص ہوگا۔

علی نے خلیفہ کے پاس جاکر راہب کی ساری گفتگو دہرا دی۔ جب اس نے مقلاص کا نام لیا تو منصور ہنس پڑا اور اسے بشارت جان کر سواری سے اُترا اور اپنے کوڑے سے زمین



ناپنے لگا۔ پھر اس نے انجینئر بلائے اور ریت پر نشاندہی کا حکم دیا۔ علی نے کہا: امیر المومنین! آپ راہب کی ضد میں اسے جھٹلانا چاہتے ہیں؟ خلیفہ نے کہا: ''ہرگز نہیں۔ اللہ کی قسم! میں ہی مقلاص ہوں اور میں نہیں سمجھتا کہ میرے علاوہ کسی اور کا لقب مقلاص ہوسکتا ہے۔ ہم بنی امیہ کے عہد میں جب جبال السراۃ (شام) کے نواح میں تھے، ہمارا حال تمھارے علم میں ہے۔ میں اور میرے ہم عمر عم زاد اور خالہ زاد کھیلتے کودتے اور اکٹھے رہتے تھے۔ ایک دن کھلانے پلانے کی میری باری تھی اور میرے پاس ایک درہم بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کوئی حیلہ کروں۔ اتنے میں ایک ہرن دیکھا جس کی مالکہ ایک دایہ تھی۔ میں نے اسے چرا کر بیچ دیا اور اس کی قیمت سے اشیائے ضرورت خرید لیں، پھر اسی دایہ کے پاس جا کر کہا کہ ہمارے لیے کھانا تیار کر دے۔ وہ بولی: تم یہ سب کچھ کہاں سے لائے ہو؟ میں نے کہا: ایک ساتھی سے چند درہم ادھار لیے تھے۔ اس عورت نے کھانا تیار کر دیا۔ جب ہم کھا چکے تو باتیں کرنے لگے۔ ادھر وہ عورت ہرن ڈھونڈنے لگی، اسے پتہ چلا کہ ہرن میرے پاس ہے۔ اس علاقے میں ایک بدنام چور تھا جسے مقلاص (بڑا چور) کہا جاتا تھا۔ اس نے ہمارا دروازہ آن کھٹکھٹایا۔ میں اس ڈر سے باہر نہ نکلا کہ وہ میری کارگزاری جان گئی ہے۔ آخر وہ چلا کر بولی: ''او مقلاص! باہر نکل۔'' لوگ تو علاقے کے مقلاص سے ڈرتے تھے اور ادھر میں مقلاص ہوتے ہوئے گھر میں دبکا ہوا تھا۔ میرے خالہ زاد اور عم زاد بھائیوں نے اس روز مجھے مقلاص کا لقب دے کر مذاق اڑایا۔ اس کے بعد میں نے یہ نہیں سنا مگر آج یہ نام سن کر مجھے یقین ہوگیا ہے کہ یہ شہر میرے ہی ہاتھوں آباد ہوگا کیونکہ اس راہب کی زبانی مجھ تک جو بات پہنچی ہے وہ درست ہے۔''

دجلہ کو وادی السلام کہتے تھے، اس لیے خلیفہ منصور نے شہر کا نام مدینۃ السلام (شہرِ امن) رکھا مگر معروف نام بغداد ہی رہا۔ اس نے بغداد کو بے مثال شہر بنانے کے لیے مختلف ملکوں سے ہزاروں ماہرینِ فن بلائے اور اس کے بازاروں اور تعمیرات پر کروڑوں درہم صرف کیے۔ شہر کا طول 2 میل اور عرض بھی اتنا ہی تھا۔ یہ دنیا کا پہلا شہر تھا جو 146ھ/762ء میں دائرے میں بسایا گیا۔ اس کی تعمیر کے لیے منصور نے مدائن کے ایوانِ کسریٰ کو گرانے کا ارادہ کیا۔ ایک ایرانی مشیر نے مشورہ دیا کہ اگر آپ اس ایوان کو باقی رکھیں گے تو ہر دیکھنے والے پر یہ تاثر قائم ہوگا کہ مسلمانوں کو اللہ کی مدد حاصل تھی۔ منصور نے خیال کیا کہ شاید مشیر شاہانِ ایران کی یادگار قائم رکھنے کے لیے یہ مشورہ دے رہا ہے، چنانچہ ایوانِ کسریٰ منہدم کرنے کا حکم دیا مگر جب توڑ نا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ توڑنے پر بہت زیادہ لاگت آئے گی اور کارآمد سامان بہت کم نکلے گا۔ خلیفہ نے اسی مشیر سے پھر مشورہ کیا تو اس نے کہا: اب میں آپ کے لیے یہ بات عار سمجھتا ہوں کہ لوگ کہیں گے اہل فارس نے ایسی عمارت بنائی تھی کہ مسلمان اسے توڑ بھی نہ سکے، لہٰذا اب میرا مشورہ ہے کہ اسے ضرور توڑا جائے، تاہم منصور نے یہ کہہ کر مزید انہدام روک دیا کہ اس میں دولت کا بڑا ضیاع ہے۔ یوں ایوانِ کسریٰ جسے خسرو اول نوشیرواں نے تعمیر کرایا تھا، اس کا بچا کھچا حصہ طاقِ کسریٰ کے نام سے باقی ہے۔ بغداد جلد ہی علماء وفضلاء کا مرکز بن گیا۔ اطراف واکناف سے لوگ بغداد کا رخ کرنے لگے۔ یہاں محدثین، مفسرین اور فقہاء کے تدریسی حلقے قائم ہوگئے۔

بغداد کے روشن ستارے

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام ابو یوسف رحمہ اللہ، امام محمد شیبانی رحمہ اللہ، موسیٰ خوارزمی، الجاحظ، امام موسیٰ کاظم رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، امام غزالی رحمہ اللہ، خطیب بغدادی رحمہ اللہ، شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ جنید بغدادی رحمہ اللہ، یعقوب الکندی، معروف کرخی (م200ھ)، سری سقطی (م251ھ)، حنین بن اسحٰق، ثابت بن قرہ اور بیسیوں دیگر اہل علم وفضل بغداد کی شان تھے۔ ہارون الرشید اور مامون الرشید نے بغداد میں بیت الحکمت قائم کیا جہاں یونانی اور سنسکرت کی کتابوں کے تراجم ہوتے تھے۔ ہارون نے بغداد میں قصر رصافہ بنوایا اور اس کی ملکہ زبیدہ نے دجلہ کنارے مسجد زبیدہ تعمیر کرائی، نیز شمالی بغداد میں مسجد قطیعہ اور قصر القرار تعمیر کرایا۔ رصافہ (مغربی بغداد) میں موسیٰ کاظم رحمہ اللہ، دفن ہوئے، چنانچہ وہ آج تک کاظمیہ کے نام سے مشہور ہے۔ ہارون نے انھیں قید میں ڈالا تھا اور وہیں فوت ہوئے۔ مزار موسیٰ کاظم کے احاطے میں جنوبی جانب جامع مسجد ابی یوسف ہے۔ مسجد کے ایک حصے میں امام ابو یوسف کا



مزار ہے جو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) تھے۔ یہ لقب سب سے پہلے انھی کے لیے استعمال ہوا۔ شیخ جنید بغدادی رحمہ اللہ باعمل صوفی تھے۔ اسی لیے ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ جنید رحمہ اللہ کے نزدیک صحیح معنوں میں صوفی وہی ہو سکتا ہے جو حافظ قرآن ہو اور علم حدیث میں اسے رسوخ حاصل ہو۔ جنید رحمہ اللہ پابندِ شریعت تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے شاگرد منصور حلاج کی گمراہی پر اس سے تعلقات توڑ لیے۔ وہ 297ھ میں فوت ہوئے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے مزار کے قریب ان کا قائم کردہ مدرسہ آج بھی قائم ہے جس میں وہ روزانہ تفسیر، حدیث اور فقہ کا ایک ایک سبق پڑھاتے تھے۔ ظہر کے بعد مختلف قراءتوں میں تلاوت فرماتے۔ شیخ عموماً شافعی اور حنبلی مسلک کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔ مشرقی بغداد کرخ کہلاتا تھا جہاں امام ابوحنیفہ (امام اعظم رحمہ اللہ) دفن ہیں، وہ علاقہ اب اعظمیہ کہلاتا ہے۔ ان سے پہلے یہ ایک قبرستان تھا اور خلیفہ مہدی کی ملکہ خیزران کی نسبت سے مقبرۃ الخیزران کہلاتا تھا۔ خطیب نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ مشہور سیرت نگار محمد بن اسحٰق رحمہ اللہ بھی یہیں مدفون ہیں۔ ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا نام نعمان بن ثابت تھا۔ وہ ایرانی نژاد تھے۔ ابو حنیفہ رحمہ اللہ کوفہ میں پیدا ہوئے تھے۔ کوفہ کے اموی گورنر ابن ہبیرہ نے انھیں قید میں ڈالا۔ پھر کئی سال مکہ میں مقیم رہے۔ خلیفہ منصور کی طرف سے قضا کا منصب قبول نہ کرنے پر انھیں بغداد میں قید کاٹنی پڑی۔ ابوحنیفہ رحمہ اللہ 150ھ میں وفات پا گئے۔ ابو یوسف رحمہ اللہ اور محمد شیبانی رحمہ اللہ ان کے شاگرد تھے۔

مامون، معتصم اور واثق باللہ کے ادوار میں فتنہ معتزلہ نے زور پکڑا تو بغداد میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (164ھ-780ء-241ھ/ 855ء) کو خلق قرآن کے مسئلے پر قید و بند کا سامنا کرنا پڑا۔ عباسی عہد میں بغداد میں علم و معرفت کی بہار چھائی رہی۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں جہاں بھی گیا مجھے یاد ہے مگر یہ یاد نہیں کہ بغداد کتنی بار گیا۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے یونس بن عبدالاعلیٰ الصوفی سے پوچھا: کیا تم بغداد گئے ہو؟ اس نے انکار میں سر ہلایا تو فرمایا: ''پھر تم نے دنیا اور لوگوں کو دیکھا ہی نہیں۔''

خلیفہ معتمد علی اللہ کے عہد (256ھ-279ھ) میں عروس البلاد بغداد کی شان و شوکت عروج پر تھی۔ اسے فردوسِ ارضی بھی کہا جاتا تھا۔ یہاں کے ریشمی و سوتی کپڑے سقلطون، ملحم اور عتابی دنیا بھر میں مشہور تھے۔ خلیفہ مقتدر باللہ کے شاہی طبیب سنان بن ثابت نے بغداد میں 860 طبیبوں کو اجازت نامے دیے۔ بیمارستان السیدہ، بیمارستان مقتدری اور بیمارستان عضدی یہاں کے مشہور شفا خانے تھے۔ آخر الذکر عضد الدولہ بویہی نے قائم کیا تھا۔ اسی نے سب سے پہلے تعزیے کا جلوس بغداد میں نکالا۔ آل بویہ کے بعد عباسی خلافت میں سلاجقہ کو عروج حاصل ہوا تو سلطان ملک شاہ سلجوقی (1073ء تا 1092ء) کے وزیر نظام الملک طوسی نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم کیا۔ امام غزالی اسی مدرسے کے فارغ التحصیل تھے۔

شہدائے بغداد

یہ بھی عجیب بات ہے کہ بغداد پانچ صدیوں تک خلفائے عباسیہ کا دارالخلافہ رہا لیکن ان میں سے کسی کا اس شہر میں انتقال نہیں ہوا حتی کہ امین الرشید دجلہ میں کشتی رانی کرتے ہوئے شہر سے دور نکل گیا تھا، وہیں گرفتار اور قتل ہوا۔ ہارون الرشید کا مرقد طوس (ایران) میں ہے جبکہ مامون الرشید جہادِ روم کے دوران میں طرسوس (ترکی) میں فوت ہو کر وہیں دفن ہوا۔ 656ھ /1258ء میں ہلاکو خاں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کے احوال پہلی قسط میں بیان ہو چکے ہیں۔ تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کے 34 روزہ قتل عام میں 8 تا 10 لاکھ مسلمان شہید ہوئے۔ خلیفہ مستعصم باللہ اور ان کے بیٹے احمد اور ابوبکر، مورخ ابن جوزی (سبط) اور ان کے تینوں بیٹے، شافعی عالم شہاب الدین محمود زنجانی رحمہ اللہ، مدرسہ نظامیہ کے نحوی جمال الدین عبداللہ، شیخ الخلیفہ صدرالدین علی، شاعر علی الرصافی، محدث حسین بن داؤد واسطی رحمہ اللہ اور عمر بن دہمان رحمہ اللہ، عبداللہ بن عساکر بعقوبی، یحییٰ بن سعد البردی، کاتبِ دیوان عبدالقادر فوطی، احمد بن مسعود البعلی، عبداللہ بن یاسر البعلی، عبدالوہاب بن الصدر، محمد و عبدالرحمٰن ابنائے سکینہ اور محمد بن الہیثمی جیسے اہل علم و فضل اور ارکانِ دولت شہدائے بغداد میں شامل تھے۔ بہت کم شہری تھے جو چھپ چھپا کر زندہ رہے۔ اکبر شاہ خان نجیب آبادی کے بقول ''تاتاریوں (مغول) کے ہاتھوں بغداد اور مضافات میں ایک کروڑ چھ لاکھ مسلمان



شہید ہوئے۔ خلیفہ کو بھوکا رکھا گیا۔ اس نے کھانا مانگا تو ہلاکو کے حکم پر تشت میں ہیرے جواہر کھانے کو دیے گئے۔ خلیفہ نے عذر کیا تو ہلاکو نے کہلا بھیجا: ''جو چیز کھا نہیں سکتے وہ رعایا کی جان بچانے کے لیے خرچ کیوں نہ کی؟'' پھر مستعصم باللہ کو نمدے میں لپیٹ کر ستون سے باندھ دیا گیا۔ جب دم نکل گیا تو لاش پر سے گھوڑے دوڑا کر اسے کچل دیا گیا۔ لاکھوں گرانقدر کتابیں دجلہ میں پھینک دی گئیں۔ امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ کی ''مفردات'' کا قلمی نسخہ عبداللہ بن محمد بن عبدالقادر مکی نے دجلہ میں پڑا پایا جو آج کتب خانہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ (بغداد) میں محفوظ ہے۔ شاعر تقی الدین اسماعیل نے مرثیہ بغداد میں کہا: ''بغداد کے غم میں آنسو بہانے والے سے مجھے یہ کہنا ہے کہ تو کس لیے یہاں کھڑا ہے، تیرے پیارے تو سب جا چکے۔''

تاتاری بادشاہ کا قبولِ اسلام

694ء میں بغداد ہی میں شاہ تاتار قازان (غازان) بن ارغون بن اباقہ بن ہلاکو کے قبول اسلام کا واقعہ پیش آیا اور پھر وہ سلطان محمود غازان خان کہلایا۔ امیر تیمور نے تشیع اختیار کرنے کے بعد 795ھ اور 803ھ میں دوبارہ بغداد پر حملہ کیا۔ دوسری بار اہلِ شہر کا بے دریغ قتل عام کیا۔ محلے ویران کر دیے گئے۔ یہ جلائری سلطنت (740ھ/1339ء تا 813ھ/1410ء) کے عہد کا بغداد تھا۔

جلائریوں کے بعد شیعہ قرہ قویونلی ترکمان 873ھ/1468ء تک بغداد پر قابض رہے۔ اس عہد میں بغداد مزید ویران ہوا۔ مورخ مقریزی نے 841ھ/1437ء میں بغداد کا نقشہ یوں بیان کیا: بغداد تباہ ہوگیا۔ اس میں کوئی مسجد نہیں اور نہ جمعہ ہوتا ہے۔ نہ کوئی بازار ہے۔ اس کی اکثر نہریں خشک ہوچکی ہیں۔ اب اسے مشکل ہی سے شہر کہا جاسکتا ہے۔'' قرہ قویونلی (سیاہ بھیڑوں والے) ترکمانوں سے بغداد آف قویونلی (سفید بھیڑوں والے) ترکمانوں نے چھین لیا۔ ان کے بعد ایرانی شیعہ صفوی بغداد پر قابض رہے حتی کہ دوسرے عثمانی خلیفہ سلیمان اعظم نے 941ھ/1534ء میں اسے سلطنت عثمانیہ کا حصہ بنالیا۔

پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی حفظہ اللہ کے قلم سے

بیٹی کی شان و عظمت

- اللہ تعالیٰ کا بیٹیوں کا ذکر بیٹوں سے پہلے کرنا
- بیٹی کی پیدائش پر افسردہ ہونے کا کافروں کی صفات میں سے ہونا
- نیک بیٹیوں کا ثواب اور اُمید میں بیٹوں سے بہتر ہونا
- بیٹیوں کا محسن باپ کے لیے دوزخ کے مقابلہ میں رکاوٹ بننا
- دو بیٹیوں کے سرپرست کو روزِ قیامت رفاقتِ نبوی ﷺ میسر آنا
- بیٹیوں کے لیے ایثار کرنے والی والدہ کے لیے وجوب جنت
- بیٹی کی رضامندی کے بغیر نکاح کا نہ ہونا
- نبی کریم ﷺ کے اُسوۂ حسنہ میں بیٹی کا مقام

کتاب کے چند اہم عنوانات

نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے میں خواتین کی ذمّہ داری

- احتساب کے متعلق خواتین کی ذمہ داری
- خواتین کے احتساب کرنے کی اہمیت
- خواتین کے عام لوگوں، اقربا اور معارف کے احتساب کے ۵۷ واقعات
- خواتین کے علماء اور طلبہ کا احتساب کرنے کے ۷ واقعات
- خواتین کے اہل اقتدار کے احتساب کرنے کے ۶ واقعات
- بازار میں بحیثیت محتسبہ عورت کی تقرری کی ممانعت کے دلائل

کتاب کے چند اہم عنوانات

کتاب کے امتیازی خصائص

- کتاب کی اساس قرآن و سنت
- کتب تفسیر اور شروح حدیث سے راہ نمائی
- احتساب کے ہر واقعہ سے حاصل شدہ دروس اور اس کے ساتھ ہی اختصار سے بیان

رعائتی قیمت -/100 روپے ◉ عمدہ امپورٹڈ کاغذ ◉ معیاری طباعت ◉ خوبصورت سرورق رعائتی قیمت -/250 روپے

ملنے کے پتے

دار النور اسلام آباد
0333-5139853
0321-5336844

مکتبہ قدوسیہ
رحمان مارکیٹ ◉ غزنی سٹریٹ ◉ اردو بازار ◉ لاہور

Find us on Facebook
Ph: 42-37351124 , Cell: 0321-4460487
E-mail: maktaba_quddusia@yahoo.com

غیر معروف مگر صحیح یا حسن احادیث



ابوانس

① علم سیکھنا اور آگے بیان نہ کرنا.....!

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس شخص کی مثال، جو علم سیکھتا ہے مگر اسے کسی سے بیان نہیں کرتا، اس شخص جیسی ہے جو خزانے جمع کرتا ہے مگر اس میں سے خرچ نہیں کرتا۔''(المعجم الأوسط: 689/123/1 بحوالہ السلسلة الصحیحة: 3479)

② آنکھوں سے محروم لوگوں کو صحیح راستہ بتانا!

کئی لوگ نابینا افراد کو غلط راستے پر ڈال کر مذاق بناتے ہیں۔ پیغمبر ﷺ نے ایسے افراد پر لعنت کرتے ہوئے فرمایا: «لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ كَمَهَ الْأَعْمٰى عَنِ السَّبِيلِ» ''اللہ اس پر لعنت کرے جس نے کسی نابینا شخص کو راستے سے ہٹا دیا۔''(المستدرك للحاكم: 356/4)

③ کسی شخص اور اس کے بیٹے کے درمیان نہ بیٹھیں!

سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا يَجْلِسُ الرَّجُلُ بَيْنَ الرَّجُلِ وَابْنِهِ فِي الْمَجْلِسِ» ''کوئی شخص کسی آدمی اور اس کے بیٹے کے درمیان مجلس میں نہ بیٹھے۔''(السلسلة الصحیحة: 3556)

④ مومن شیطانوں کو تھکا مارتا ہے!

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک مومن اپنے ساتھ موجود شیطانوں کو اس طرح تھکا مارتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی ایک سفر میں اپنے اونٹ کو تھکا دیتا ہے۔(مسند احمد: 380/2)

⑤ عقلمند کون؟

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے عرض کی: مومنوں میں سے کون افضل ہے؟ فرمایا: «أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا» ''جو اخلاق کے اعتبار سے ان میں سے اچھا ہو۔'' اس نے پھر سوال کیا: کون سا مومن عقلمند اور دانا ہے؟ فرمایا: «أَكْيَسُهُمْ أَكْثَرُهُمْ لِلْمَوْتِ ذِكْرًا وَأَحْسَنُهُمْ لَهُ اسْتِعْدَادًا، أُولٰئِكَ الْأَكْيَاسُ» ''مومنوں میں سے سب سے زیادہ سمجھ دار وہ ہے جو اپنی موت کو کثرت سے یاد رکھتا ہے اور اس کی بھرپور تیاری بھی کرتا ہو، یہی لوگ دانا اور سمجھدار ہیں۔'' (السلسلة الصحیحة: 372/3، حدیث: 1384)

⑥ زندگی گزارنے کا ایک راہ نما اصول

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وَإِيَّاكَ وَكُلَّ أَمْرٍ يُعْتَذَرُ مِنْهُ» ''اپنے آپ کو ہر ایسے معاملے سے بچا کر رکھو جس سے (بعد میں) معذرت کرنی پڑے۔'' (مسند الفردوس: 51/1/1 بحوالہ السلسلة الصحیحة: 408/3، حدیث: 1421)

⑦ نماز میں اپنی موت کو یاد کرو!

فرمان نبوی ہے: ''اپنی نماز میں موت کو یاد رکھا کرو کیونکہ ایک شخص جب اپنی نماز میں موت کو یاد رکھے گا تو اپنی نماز کو بہتر اور عمدہ بنانے کی کوشش کرے گا۔ اور ایسی نماز پڑھو کہ اس کے بعد کسی اور نماز کا موقع نہیں ملے گا۔''(مسند الفردوس: 1/1/1 5 بحوالہ السلسلة الصحیحة: 408/3، حدیث: 1421)

قصہ اسلامی ناموں کے بگڑنے کا

میڈیا پر غلط استعمال ہونے والے اسلامی ناموں کی نشاندہی



محسن فارانی

10 فروری 2013ء کو لاہور میں میٹرو بس منصوبے کا افتتاح ہوا۔ افتتاحی تقریب میں شرکت کے لیے ترک مہمان بھی آئے تھے۔ ان کی یہاں بڑی عزت افزائی ہوئی، تاہم ہمارے بیشتر میڈیا نے ترک مہمانوں کے اچھے بھلے اسلامی ناموں کو بگاڑ کر اچھا نہیں کیا۔ ایک بڑے قومی اخبار میں ترکی کے نائب وزیراعظم کا نام ''بیکر بزدیگ'' چھپا۔ ترکی کی 99.9 فیصد آبادی مسلمان ہے۔ ظاہر ہے نائب وزیر اعظم ترکیہ کا اسلامی نام ''بکر'' (Bekir) ہے جسے مترجم خبر نگار نے بیکر (یورپی مسیحی نام) بنا دیا جیسے کہ ولیم بیکر امریکی صدر ابا بُش کا وزیر خارجہ تھا۔ ترکوں کے نام عموماً عربی اسلامی اور ترکی یعنی مخلوط ہوتے ہیں، چنانچہ ترک نائب وزیر اعظم کا نام بکر (عربی) اور بُزداگ (ترکی) سے مرکب ہے۔

''داگ'' یا ''داغ'' ترکی زبان میں پہاڑ کو کہتے ہیں اور ''بُز'' کے معنی ہیں بکرا، لہٰذا ''بُزداغ'' پہاڑی بکرا ہوا۔ داگ (داغ یا تاغ) بمعنی پہاڑ کی نسبت ہی سے سیاچن گلیشیئر کا مقامی نام ''مُزتاغ'' (برف کا پہاڑ) ہے، یعنی سیاچن مُزتاغ، کیونکہ اس کے ساتھ چینی صوبہ شن جیانگ (مشرقی ترکستان) واقع ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ استنبول کی کمپنی اولسیم کے جنرل منیجر کا نام عمر یلدیر نہیں بگڑا ورنہ بعض بقراط ''عمر'' کو بھی ''اومر'' بنا سکتے ہیں۔ استنبول کے نائب میئر احمد سلامت بھی ترک وفد میں شامل تھے۔ اخبار میں ایک جگہ تو ان کا نام درست تھا مگر دوسری جگہ اسے ''احمت سلامت'' لکھا گیا تھا۔

دراصل ترکی زبان 100 سال پہلے تک عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ پھر پہلی جنگ عظیم کے بعد مصطفیٰ کمال پاشا جرنیلی فتوحات کے ذریعے ملک کے سیاہ وسفید کا مالک بن بیٹھا۔ اس نے وحدتِ اُمت کی علامت خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر کے اسلام دشمنی پر مبنی اقدامات کیے۔ عربی زبان کی تعلیم اور عربی اذان پر پابندی لگا دی، نیز ترک قوم پر عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط مسلط کر دیا۔ اس کے نتیجے میں محمد اور احمد جیسے پاکیزہ نام بھی لاطینی حروف میں Mehmet اور Ahmet بن کر مخصوص اسلامی شناخت سے محروم ہو گئے۔ نئے رسم الخط میں حرف دال کے لیے T اور جیم کے لیے C مخصوص ہیں، چنانچہ ترکی کے ایک سابق وزیراعظم بلند اجود کا نام انگریزی (لاطینی) کے واسطے سے اردو میں ''بلنت ایجوت'' یا ''بلند ایجوت'' بن جاتا تھا کیونکہ اس کا لاطینی تلفظ Bulent Ecivet تھا۔ اس لاطینی مار کے باعث ایک اور ترک وزیراعظم نجم الدین اربکان کے نام کا پہلا جزو نجم الدین شروع شروع میں ہمارے اردو اخبارات میں نسمتین (Necemettin) چھپتا رہا۔ روزنامہ ''جنگ'' میں ڈاکٹر مرزا اختیار بیگ نے اپنے کالم میں حالیہ دورۂ امریکہ و جمیکا کا جو حال لکھا ہے، اس میں ترک قونصل جنرل درجمیکا کا نام ''اکوت ایکن'' لکھا۔ یقیناً یہ اکوَت بھی دراصل ''اجود'' ہی ہوگا۔ یاد رہے عربی نام اَجْوَدْ کے معنی ''سب سے زیادہ جُود (سخاوت) کرنے والا'' کے ہیں۔ ترک نائب وزیراعظم Bekir Bozdag (بکر بُزداغ) کا نام بھی اسی طرح بگڑا ہے۔ عربی رسم الخط والی ترکی کا ''داغ'' بمعنی ''پہاڑ'' اب dag (داگ) بن گیا ہے۔ ''بکر'' سے یاد آیا کہ جنوب مشرقی ترکی کا ایک شہر دیار بکر (Diyar Bakir) ہے جسے اردو اٹلسوں میں غلط طور پر ''دیار باقر'' لکھا جاتا ہے۔ دراصل یہ شہر مشہور عدنانی عرب قبیلہ بنوبکر بن وائل سے منسوب ہے جو الجزیرہ کے شمالی علاقے میں آباد ہو گئے تھے۔ ایک ہفت روزہ میں ترک انٹیلی جنس کے سربراہ کا نام حاکن فدان لکھا



دیکھا۔ یہ ''حاکن'' دراصل خاقان بمعنی ''بادشاہ'' ہے۔ ترکی میں حرف خ کے لیے H استعمال ہوتا ہے۔ بس نیچے ایک نقطہ ڈال دیتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے ایک کالم بعنوان ''وقار ملک سابقہ کرشن چندر'' (روزنامہ ''نئی بات'') میں ترک ناول نگار ''ارہان پاموک'' کے ذکر پر یاد آیا کہ یہ ''ارہان'' تو اصل میں ''اُورخان'' ہے جو دوسرے عثمانی سلطان کا نام تھا جس نے ایشیائے کوچک (Asia Minor) سے آگے بڑھ کر سلطنت کی حدود کو یورپ میں پہنچا دیا تھا۔

ترکی کے صدر عبداللہ گل کی حجاب پوش اہلیہ کا نام خیر النساء ہے جسے ہمارے ہاں ''ہیر النساء'' بنا دیا جاتا ہے۔

پچھلے دنوں ڈرون حملوں کی مذمت کرنے والے مصنف کا نام ''ابراہیم موتھنا'' پڑھا تو اخبار کے خبر نگار کی بے خبری پر افسوس ہوا۔ اس نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ عربی زبان میں تو اردو کا مخلوط حرف ''تھ'' ہے ہی نہیں، پھر انگریزی خبر کا Muthanna (مُثنّٰی) موتھنا کیونکر بن سکتا ہے۔ عربی ناموں کی ٹرانس لٹریشن میں حرف ''ث'' کے لیے th مخصوص ہے۔ اسی لیے مُثنّٰی کو Muttanna لکھا جاتا ہے۔ سیدنا مُثنّٰی بن حارثہ رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابی سپہ سالار تھے جنھوں نے جنگ جسر (عراق) میں بہت بڑے ساسانی ایرانی لشکر کو دندان شکن شکست دی تھی اور اس جنگ میں لگنے والے زخم کے بگڑنے سے بعد میں وہ شہید ہو گئے تھے۔ ان کے نام سے عراق کے جنوبی صوبے کا نام ''مثنیٰ'' ہے جسے امریکہ کی جنگ عراق کے دنوں میں ہمارے اردو اخبارات ''متھنا'' لکھ ڈالتے تھے۔ ایسے ہی مصر کے سابق آمر حسنی مبارک کی کابینہ کے ایک وزیر کا نام جمعہ تھا جو انگریزی خبر کے ترجمے میں ''گما'' یا ''گوما'' بن جاتا تھا۔ ہمارے صحافی اس پر دھیان ہی نہیں دیتے کہ ایک عربی شخص کے نام میں ''گ'' کیونکر لکھا جا سکتا ہے جبکہ عربی حروف ابجد میں یہ موجود ہی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض عرب ملکوں اور بعض قبائل میں حرف جیم غیر عربی ''گ'' کی آواز دیتا ہے مگر اسے لکھا تو ''ج'' ہی جاتا ہے۔ ہمارے دوست سعید رومی جو مشرقی پاکستان کے دنوں میں وہاں ایئر ٹریفک کنٹرولر کے منصب پر فائز تھے، وہ بتاتے ہیں کہ ان کے ایک ہمکار بنگالی کا نام ''جلیل'' تھا مگر سب بنگالی اور وہ خود بھی اس عربی لفظ کو ''ذلیل'' کہہ کر ادا کرتے تھے کیونکہ ان کے لہجے میں ''ج'' کی صوتی ادائیگی ذال بن جاتی ہے۔

ان دنوں شام کی خبریں آتی ہیں تو وہاں کے شہروں اور علاقوں کے نام اکثر بگڑ جاتے ہیں، مثلاً شام کے شمال مشرق میں ایک صوبہ حسکہ ہے جس کا دارالحکومت بھی حسکہ ہے۔ 12 فروری 2013ء کے اخبار میں خبر تھی کہ حسکہ میں دو بم دھماکوں میں 16 انٹیلی جنس افسر ہلاک ہو گئے۔ لیکن خبر میں حسکہ (Haskeh) کے بجائے ''ہساکے'' چھپا تھا۔ ان دنوں شام کے لیے اقوام متحدہ اور عرب لیگ کے مصالحت کار الاخضر براہیمی ہیں مگر انگریزی خبروں کے ترجمے میں ان کا نام ''لخذر براہیمی'' بن جاتا ہے۔ 13 فروری کی خبر میں بتایا گیا کہ ''اسلام پسند شامی باغیوں نے صوبہ راکا میں تابکا (طبقہ؟) قصبے کا کنٹرول سنبھال لیا ہے، نیز الجراح فوجی ایئر پورٹ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اے ایف پی کو یہ اطلاع حریت پسند کارکن ابوحشام نے دی۔''

درحقیقت مذکورہ صوبہ ''راکا'' نہیں بلکہ ''رقہ'' ہے۔ دریائے فرات کے کنارے یہ تاریخی قصبہ خلیفہ ہارون الرشید کا گرمائی دارالحکومت تھا، چنانچہ رقہ کو مدینۃ الرشید بھی کہا جاتا تھا۔ صوبہ حلب میں الجراح نامی فوجی ہوائی اڈا فاتح شام سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے مگر ایک اخبار کی خبر میں اسے یکسر بگاڑ کر ''الحجار'' بنا دیا گیا۔ پھر مذکورہ ''ابو حشام'' دراصل ''ابو ہشام'' ہے۔ ابوجہل کا اصل نام عمرو بن ہشام تھا اور سیرت نگار ابن ہشام کا نام تو معروف زمانہ ہے۔ ہشام بن عبدالملک اُموی خلیفہ تھے۔

زبان و بیان اور ناموں کی اس ابتر صورت حال میں خیال آتا ہے کہ مستقبل میں یہ قوم اسلامی ناموں سے اور بے بہرہ ہو جائے گی جیسا کہ میاں شہباز شریف نے انگریزی کی پرستش کے جنون میں پنجاب میں اردو میڈیم ختم کر کے جبراً انگلش میڈیم مسلط کر دیا ہے۔ اس وقت یہ حال ہے کہ چند فیصد انگلش میڈیم طبقے نے ذُہیب اور مُعِزّ جیسے اسلامی ناموں کو بگاڑ کر ''ذوہیب'' اور ''معیز'' بنا دیا ہے تو جب سو فیصد انگلش میڈیم کا سکہ چلے گا تو اسلامی ناموں، اسلامی تہذیب اور اسلامی عقائد کا کیا بنے گا؟ یہ سوال محبِّ قوم اہل دانش و قائدین کرام کے سنجیدہ غور و فکر اور عملی اقدام کا تقاضا کرتا ہے۔ یاد رہے ''ذُہیب'' کے معنی ہیں: ذہب (سونے) جیسا۔ اور مُعِزّ، عزت دینے والا کے معنی میں ہے، جیسے ''معز الدین'' فاتحِ ہند شہاب الدین غوری کا نام تھا۔ معزّ اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام بھی ہے۔



جعل سازی اور دھوکا دہی سے بچ جائیں

مولانا لیاقت علی باجوہ فیروز پوری

مارکیٹ میں جب ایک نمبر چیز موجود ہو تو چند ہی دن بعد بالکل اسی طرح کی چیز جعلی اور دو نمبر مارکیٹ میں آ جاتی ہے۔ اکثر لوگ اس دھوکے میں آ جاتے ہیں۔ جعل سازی اور دھوکا بازی کے متعلق نبی کریم ﷺ کا بڑا سخت بیان ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «وَمَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا» ''اور جو ہمیں دھوکا و فریب دے وہ ہم میں سے نہیں۔'' (صحیح مسلم: 101)

صحیح مسلم ہی کی ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا غلے کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزر ہوا، آپ نے اس ڈھیر میں اپنا ہاتھ داخل کیا تو آپ کی انگلیوں نے تری محسوس کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَا هٰذَا يَا صَاحِبَ الطَّعَامِ؟» ''اے غلے والے! یہ کیا ہے؟'' اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! اسے بارش پہنچی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَفَلَا جَعَلْتَهُ فَوْقَ الطَّعَامِ حَتّٰى يَرَاهُ النَّاسُ» ''تو نے اس کو غلے کے اوپر کیوں نہ کر دیا تا کہ لوگ اسے دیکھ لیں۔''

پھر فرمایا: «مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا» ''جس نے ہم سے دھوکا کیا وہ ہم میں سے نہیں۔'' (صحیح مسلم: 102)

آج کل آپ بازار میں چلے جائیں کوئی بھی پھل خریدیں یا سبزی خریدیں، سامنے بڑی بہترین چیزیں ہوں گی لیکن جو آپ کو دیں گے وہ تو آپ کو گھر میں پتہ چلے گا۔ سب آدھی چیزیں خراب نکلیں گی، یعنی اچھے مال میں ردی مال کی آمیزش کر دیتے ہیں۔ الغرض! ملاوٹ کرنے والوں نے لوگوں کو دھوکا دینے کے بہت زیادہ طریقے اپنا رکھے ہیں۔ بعض دفعہ لوگ اس طرح بھی دھوکا دیتے ہیں کہ نیت چیز خریدنے کی نہیں ہوتی لیکن قیمت بڑھا کر بولی لگاتے ہیں تا کہ خریدنے والا دھوکا کھا کر زیادہ قیمت دے، حالانکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: «لَا تَنَاجَشُوا» ''خریداری کی نیت کے بغیر بولی میں اضافہ مت کرو۔'' (البخاري: 2140، و مسلم: 1515)

ایسی ہی ایک روایت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: «نَهَى النَّبِيُّ ﷺ عَنِ النَّجْشِ» ''نبی ﷺ نے دھوکا دینے کی نیت سے قیمت بڑھانے سے منع فرمایا ہے۔'' (صحیح البخاري: 2142، و مسلم: 1516)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا کہ وہ خرید و فروخت میں دھوکا کھا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ بَايَعْتَ فَقُلْ لَا خِلَابَةَ» ''جس سے تو سودا کرے تو یہ کہہ دیا کر کہ دھوکا نہیں ہونا چاہیے۔'' (صحیح البخاري: 2117، و صحیح مسلم: 1533)

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ چغل خوری کرتے رہتے ہیں اور بعض جھوٹی باتیں بنا کر خاوند کو بیوی سے، بچوں کو والدین سے، بھائی کو بھائی سے، رشتے دار، ہمسائے اور عزیز و اقارب کو آپس میں لڑاتے رہتے ہیں۔ ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر کے انھیں ایک دوسرے سے متنفر کرتے رہتے ہیں، حالانکہ یہ بہت بڑا جرم ہے اور یہ بھی ایک دوسرے کو دھوکا دینے کے برابر ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: «مَنْ خَبَّبَ زَوْجَةَ امْرِئٍ أَوْ مَمْلُوكَهُ فَلَيْسَ مِنَّا» ''جو شخص کسی کی بیوی یا اس کے غلام کو دھوکا دے تو وہ ہم میں سے نہیں۔'' (سنن أبي داود: 5170، حسن)

مسلمان تو دوسرے مسلمان کا ہمدرد اور خیر خواہ ہوتا ہے لیکن آج کل زیادہ تر ایسے نام نہاد مسلمانوں کی اکثریت ہے جو دھوکا، فریب اور جھوٹ وغیرہ میں ماہر ہیں۔ شیطان نے ایسے الفاظ یاد کرا دیے ہیں کہ اپنے گناہ کو بیان کرتے ہوئے ذرہ برابر نہیں جھجکتے۔ کسی شخص کے سمجھانے پر یوں گویا ہوتے ہیں: بھئی ملاوٹ نہ کریں تو کیا کریں، بھوکے مر جائیں؟ اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو جعل سازی اور دھوکے سے بچا کر رکھے تا کہ جائز طریقے سے حلال کمائیں، حلال کھائیں اور حرام سے بچ جائیں، آمین۔



ظلم اور زیادتی کو اسلام نے ہر صورت اور ہر حالت میں ناپسند کیا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوا: ﴿وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ﴾ ''اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کرسکتے، بے شک انسان بہت ظالم اور بہت ناشکرا ہے۔'' (ابراھیم34:14)

انسان اپنی جان پر بھی اور دوسروں پر بھی ظلم اور زیادتی کرتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾ ''ہم نے امانت کی ذمہ داری کو آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کیا تو ان سب نے یہ ذمہ داری اٹھانے سے معذرت کر لی اور وہ سب ڈر گئے، مگر انسان نے اسے اٹھا لیا بے شک وہ بہت ظالم اور بہت جاہل ہے۔'' (الاحزاب 22:33)

اسلام نے ظلم کو حرام قرار دیا ہے۔ اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں فرمایا: ﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ﴾ ''قیامت کے دن ظالموں کی معذرت ان کے کسی کام نہ آئے گی ان کے لیے لعنت اور برا گھر ہے۔'' (غافر52:40)

حدیث قدسی ہے، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: «يَا عِبَادِي إِنِّي حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلَى نَفْسِي وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا فَلَا تَظَالَمُوا» ''اے میرے بندو! میں نے اپنے آپ پر ظلم کو حرام کر لیا ہے اور اسے تمھارے درمیان بھی حرام کردیا، پس تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔''
(صحیح مسلم:2577)

انسان تو انسان جانوروں کے ساتھ بھی ظلم کی ہمارے دین میں اجازت نہیں۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ ایک انصاری کے باغ میں تشریف فرما تھے کہ ایک اونٹ روتے ہوئے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا، اونٹ پر سکون ہو گیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: یہ اونٹ کس کا ہے؟ ایک انصاری صحابی نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ میرا اونٹ ہے۔ آپ ﷺ نے اس صحابی سے فرمایا: کیا تم اس بے زبان کے بارے میں اللہ سے نہیں ڈرتے جسے اس نے تمھاری ملکیت میں دے دیا ہے؟ اس نے عرض کیا: کیا ہوا اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا: یہ میرے پاس شکایت کررہا ہے کہ تم اسے چارہ تو پورا کھلاتے نہیں، اسے بھوکا رکھتے ہو، مگر کام صبح سے شام تک مسلسل لیتے ہو؟ اس صحابی نے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ ایسا نہیں کرے گا۔
(سنن أبي داود: 2549)

آیئے ایک اور واقعہ دیکھتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: «عُذِّبَتِ امْرَأَةٌ فِي هِرَّةٍ سَجَنَتْهَا حَتَّى مَاتَتْ فَدَخَلَتْ فِيهَا النَّارَ، لَا هِيَ أَطْعَمَتْهَا وَسَقَتْهَا، وَلَا هِيَ تَرَكَتْهَا تَأْكُلُ مِنْ خِشَاشِ الْأَرْضِ» ''ایک عورت کو محض اس لیے عذاب دیا گیا کہ اس



نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا، حتی کہ وہ مر گئی۔ اسی سبب سے وہ عورت جہنم میں چلی گئی۔ نہ تو اس نے اسے کھانے پینے کو کچھ دیا اور نہ ہی اسے چھوڑا تا کہ وہ حشرات الارض وغیرہ ہی کھا لیتی۔'' (صحیح مسلم: 2242)

معزز قارئین! ذرا غور وفکر فرمائیں کہ ایک انسان کو، جو اشرف المخلوقات تھا، ایک بلی پر ظلم کرنے کے باعث جہنم میں ڈال دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بھی عجیب رنگ ہیں جس طرح ایک جانور پر ظلم کر کے ایک خاتون جہنم میں چلی گئی اسی طرح ایک دوسری خاتون ایک جانور پر رحم کر کے جنت میں چلی گئی۔

یہ واقعہ آپ نے کئی مرتبہ پڑھا ہوگا جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی ترجمان حق وصداقت زبان سے یہ سچا قصہ اپنے صحابہ کرام کو سنایا، فرمایا:

ایک مرتبہ یوں ہوا کہ بنو اسرائیل کی ایک عورت جو جسم فروشی کا کام کرتی تھی، سخت گرمی کے موسم میں کسی کام سے جا رہی تھی۔ راستے میں ایک جگہ اس نے عجیب منظر دیکھا۔ کیا دیکھتی ہے کہ ایک کتا گرمی کی شدت کے باعث زبان منہ سے باہر نکالے ہانپ رہا ہے اور مارے پیاس کی شدت کے وہ ایک کنویں کے قریب گیلی مٹی چاٹ رہا ہے۔ کنواں تو قریب ہی تھا مگر کتے کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ اس میں داخل ہو کر اس کا پانی پی لیتا۔ اس طوائف نے سوچا: جس طرح مجھے پیاس کے باعث گھبراہٹ اور بے چینی کا سامنا ہے اسی طرح اس کتے کو بھی شدید پریشانی اور گھبراہٹ ہو رہی ہوگی۔ یہ بھی ایک جاندار ہے، کیوں نہ میں اس کی مدد کروں اور اس کے لیے پانی کا بندو بست کروں تا کہ یہ بھی راحت وآرام پائے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ اس کے پاس کوئی رسی اور ڈول تو تھا نہیں، مگر فوراً ہی ایک تجویز اس کے ذہن میں آئی۔ اگر میں اپنا جوتا اپنے دوپٹے سے باندھ کر کنویں میں لٹکا دوں تو اس طریقے سے کچھ پانی باہر نکالا جا سکتا ہے۔ مگر وہ دوپٹہ اس قدر چھوٹا تھا کہ پانی کی سطح تک نہ پہنچ سکا۔ اب اس نے کسی متبادل تجویز پر غور کیا تو اسے کنویں کے اندر ایک جانب کچھ سیڑھیاں سی بنی ہوئی نظر آئیں۔ جیسا کہ اس دور میں رواج تھا کہ کنویں میں اترنے کے لیے کنویں کی دیوار میں پتھر کے چوڑے ٹکڑے نصب کر دیے جاتے تا کہ ان پر قدم رکھ کر آدمی کنویں میں صفائی وغیرہ کے لیے اتر سکے، اور انھی سیڑھیوں کی مدد سے باہر بھی آسکے۔ عورت نے انھی سیڑھیوں سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور ان پر آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی کنویں کے اندر کچھ گہرائی تک اتر گئی حتی کہ اس کے دوپٹے سے بندھا ہوا جوتا پانی تک پہنچ گیا۔ اس نے جوتا پانی سے بھرا اور باہر آ کر کتے کے سامنے رکھ دیا۔ کتے نے جب پانی پیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ عورت نے دو تین مرتبہ یہی عمل دہرایا حتی کہ کتا سیر ہو گیا۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس بدکردار عورت کا ایک جاندار پر رحم کرنے کا عمل اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آیا کہ اس عورت کے تمام گناہوں کو معاف کر کے اس کے لیے جنت کا فیصلہ فرما دیا۔ (صحیح مسلم: 2245)

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ظلم کرنے والا اسی دنیا ہی میں برے انجام سے دوچار ہو جاتا ہے۔ آیئے اسی تعلق سے ایک واقعہ پڑھتے ہیں:

وہب بن منبہ اس کے راوی ہیں۔ ایک ظالم اور جابر بادشاہ نے اپنا محل بنوایا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار اپنے محل کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے محل کا چکر لگایا۔ ایک کونے میں جھونپڑی دیکھی۔ ماتھے پر شکن پڑ گئی، میرا اتنا خوبصورت محل اور اس کے ساتھ لگی ہوئی یہ جھونپڑی؟ اس نے تو سارے محل کی شان و شوکت ہی گہنا ڈالی۔ اس نے پوچھا: یہ کس کی جھونپڑی ہے؟ بتایا گیا: یہ ایک غریب بڑھیا کی ملکیت ہے جو اس میں رہائش رکھتی ہے۔ حکم دیا کہ اسے گرا دو۔ جب اسے گرایا جا رہا تھا تو بڑھیا کسی کام سے اپنی جھونپڑی سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ جب وہ آئی اور دیکھا کہ اس کی جھونپڑی کو گرایا جا چکا ہے تو آس پاس کے لوگوں سے پوچھا: کس نے اسے گرایا ہے؟ کہنے لگے: بادشاہ وقت نے اسے دیکھا اور گرانے کا حکم دے دیا۔ اس بوڑھی نے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کیا اور کہنے لگی: «يَا رَبِّ! إِذْ لَمْ أَكُنْ أَنَا حَاضِرَةً فَأَيْنَ كُنْتَ أَنْتَ» ''میرے رب! اگر جھونپڑی گرائے جانے کے وقت میں وہاں موجود نہ تھی تو تو کہاں تھا؟'' «فَأَمَرَ اللّٰهُ جِبْرِيلَ أَنْ يُقَلِّبَ



الْقَصْرَ عَلَى مَنْ فِيهِ فَقَلَّبَهُ.» ''اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کو حکم دیا کہ اس محل کو جڑ سے اوپر اٹھاؤ اور پھر اس کے مکینوں سمیت اسے الٹا کر زمین پر دے مارو۔'' انھوں نے ایسا ہی کیا۔ «لَا تَظْلِمَنَّ أَحَدًا إِذَا مَا كُنْتَ مُقْتَدِرًا» ''جب تمھارے پاس قوت واقتدار ہو تو کسی بے کس پر ظلم کبھی نہ کرنا۔'' (التبصرة لإبن الجوزی: 66/1)

اسی سلسلے کا ایک اور واقعہ ملاحظہ فرمایئے:

یہ واقعہ ہمیں محترم پروفیسر غلام سرور قریشی صاحب نے مورخہ 23 نومبر 2012ء کو محترم عرفان احمد صاحب پولیٹیکل کونسلر سفارت خانہ پاکستان ریاض کے گھر پر عشائیہ میں سنایا۔ پروفیسر غلام سرور سفارت خانہ پاکستان ریاض کے ایک آفیسر جناب عباس سرور قریشی کے والد گرامی ہیں اور ان دنوں وزٹ ویزے پر اپنے لائق بیٹے کے پاس مقیم ہیں۔ پروفیسر صاحب گویا ہوئے:

میں ایک مرتبہ تیز روٹرین پر لاہور سے کراچی کے لیے سفر کر رہا تھا۔ اس گاڑی میں دو ہی درجے تھے ایک فرسٹ کلاس اور دوسرا تھرڈ کلاس کا درجہ تھا۔ حسن اتفاق کہ میں نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے رکھا تھا۔ جب میں بوگی میں داخل ہوا تو وہاں ایک ہی آدمی بیٹھا ہوا تھا، باقی سارا ڈبہ خالی تھا۔ ہم نے آپس میں گپ شپ لگانی شروع کر دی۔ جب گاڑی رواں دواں ہوگئی تو مجھے نیند آنے لگی، میں نے اپنے سفر کے ساتھی سے کہا:

ہم باتیں تو کر ہی رہے ہیں مگر ممکن ہے مجھے اچانک نیند آ جائے اور میں بیٹھا بیٹھا ہی سو جاؤں تو آپ اس کا برا نہ مانیے گا۔

میرے ہم سفر نے ایک آہ بھری اور کہنے لگا:

نیند آہ نیند! اور وہ بھی بیٹھے بیٹھے! کیا خوش قسمتی ہے؟ میں ان کی آہ سے چونکا تو وہ کہنے لگے: ''پندرہ برس ہوئے میں نیند سے محروم ہوں۔'' میں نے پوچھا: ''وہ کیسے؟'' کہنے لگے: ''اب تو میں اپنے رب سے ایک ہی دعا مانگتا ہوں: الٰہی: یا تو مجھے نیند دے دے یا موت دے دے۔''

قارئین کرام! بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت نیند بھی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا﴾ ''ہم نے نیند کو تمھارے لیے آرام کا سبب بنایا ہے۔'' (النبا 9:78)

دن بھر کی تھکاوٹ کے بعد تھوڑی سی نیند بھی انسان کو راحت اور سکون مہیا کرتی ہے اور انسان بالکل ہلکا پھلکا اور دوبارہ کام کاج کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

پروفیسر صاحب کہہ رہے تھے: میں اپنے ہم سفر کے ان الفاظ سے چونکا، اس طرح کی دعا تو شاید ہی کوئی کرتا ہو۔ میں نے پوچھا تو میرے سفر کے ہمراہی نے اپنی داستان کچھ اس طرح سنائی:

''میں ایک زمانے میں تحصیل دار تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب تحصیل دار کا منصب بہت بڑا ہوتا تھا۔ جب کبھی تحصیل دار دورے پر جاتے تو وہاں کے افسروں کی دوڑیں لگ جاتیں۔ قانون گو اور پٹواری تو ان کے سامنے بچھے چلے جاتے تھے۔ ان کے ایک اشارے پر وہ ہر چیز مہیا کرنے کے لیے تیار ہوتے۔ میں ایک مرتبہ ایک علاقے کے دورے پر گیا جہاں میں نے رات بھی گزارنا تھی۔ یہ سردی کا موسم تھا اور اس علاقے میں شدید سردی تھی۔ جب اس علاقے میں پہنچا تو علاقے کے قانون گو اور پٹواریوں نے میرا زبردست استقبال کیا۔ میرے آرام اور کھانے پینے کے لیے ہر وہ چیز مہیا کر دی جو وہ کر سکتے تھے۔

رات ہوئی تو میرے سونے کے لیے بہترین انتظام کیا گیا۔ شدید سردی کی وجہ سے آگ کا آلاؤ روشن کیا گیا۔ آرام کرنے کے کمرے کے پاس ہی ایک چوکیدار کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ رات گئے اگر کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے تو وہ اسے میرے لیے مہیا کر سکے۔

میں سونے کے بستر پر لیٹا تو نیند آنکھوں سے دور تھی۔ کمرے میں کتیا اور پلوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں جب بھی سونے کی کوشش کرتا کتیا کے پلوں کی مسلسل آوازیں میرے کانوں سے ٹکراتیں۔ میں شدید الجھن میں تھا۔ میں نے چوکیدار کو بلایا اور اس سے کہا: کسی طرح ان آوازوں سے مجھے نجات دلاؤ۔ اس نے کتیا کو بھگانے کی کوشش کی مگر تھوڑی دیر کے بعد پھر آوازیں شروع ہو جاتیں۔ میں سخت جھنجھلاہٹ کا شکار تھا۔ میں نے چوکیدار پر غصہ اتارا۔ اسے برا بھلا کہا، غالباً ایک آدھ تھپڑ بھی رسید کر دیا۔ سردی بڑی شدید تھی۔ کتیا غالباً اپنے بچوں کے لیے محفوظ مقام تلاش کر چکی



تھی۔ پلے بالکل چھوٹے تھے۔ ان کی عمر ابھی چند دنوں کی ہوگی۔ کتیا نے ایک بچے کو منہ سے اٹھایا اور محفوظ مقام پر چھوڑ آئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر آئی، دوسرے بچے کو منہ میں دبایا اور اسے بھی لے کر چل دی۔ اس طرح ایک ایک کر کے وہ اپنے بچوں کو محفوظ مقام تک پہنچاتی چلی گئی۔ آہستہ آہستہ آوازوں میں کمی آتی چلی گئی۔ میں نے سکھ کا سانس لیا کہ چلیے ان کی آوازوں سے جلد ہی جان چھوٹ جائے گی۔ ان پلوں کی تعداد سات یا آٹھ ہوگی۔ کتیا نے ایک کے سوا تمام پلوں کو محفوظ مقام تک پہنچا دیا۔ پھر یا تو وہ اس پلے کو بھول گئی یا اسے آنے میں تاخیر ہوگئی۔ ادھر یہ پلا جو اکیلا رہ گیا تھا جب اس نے دیکھا کہ اس کی ماں اسے لے کر نہیں گئی اور وہ اکیلا رہ گیا ہے تو اس نے مزید شور مچانا اور آوازیں نکالنا شروع کر دیں۔ ہم دونوں اسے چپ کیسے کروا سکتے تھے۔ یوں بھی وہ چھوٹا سا تھا۔ میں غصے میں آتا چلا گیا۔ کچھ افسری کا زعم' کچھ نیند کا غلبہ، شدید غصہ آیا، میں غصے سے پاگل ہوگیا۔ بستر سے چھلانگ لگائی، اس پلے کو پکڑا اور اٹھا کر آگ کے الاؤ میں پھینک دیا۔ چھوٹا سا کتیا کا بچہ چونکتا چونکتا آہستہ آہستہ جلنے لگا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ معصوم کونپل بن گیا۔ چند لمحوں کے لیے تو مجھے سکون ملا کہ اس کی آواز سے مجھے نجات مل گئی، مگر اس پلے کے میری آنکھوں کے سامنے جلنے نے میری نیند کو اڑا دیا۔ ہاں بھائی میں نے ظلم کیا تھا ایک معصوم جان پر کہ اس بے گناہ کو میں نے آگ میں زندہ جلا دیا تھا۔

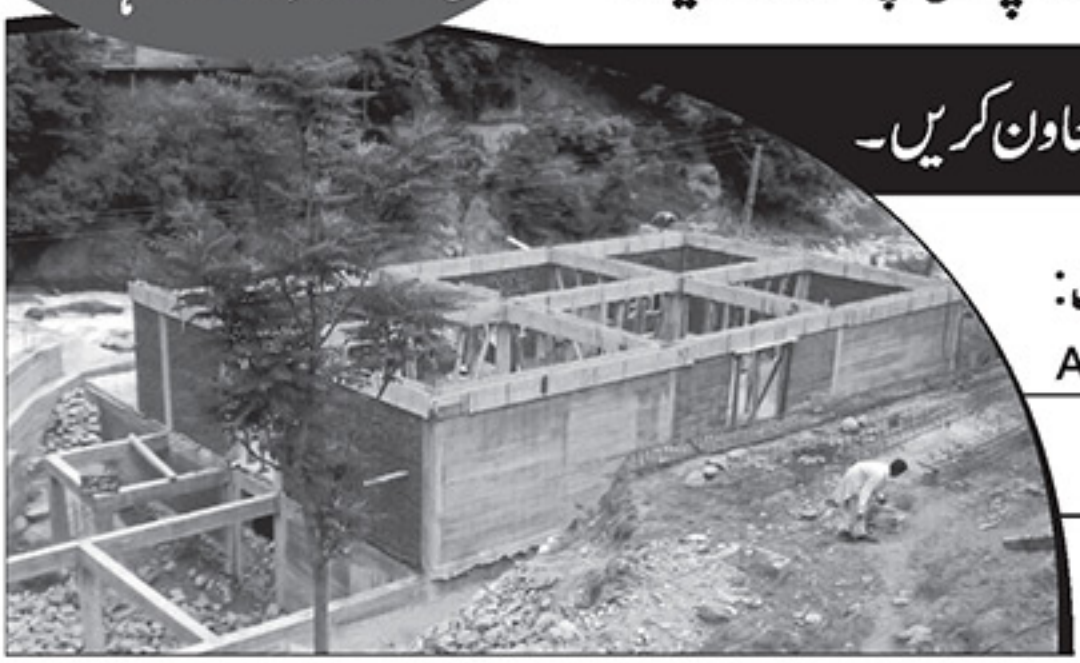
میرے دوست وہ دن اور آج کا دن، آج اس واقعہ کو پندرہ سال گزر چکے ہیں، اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر مجھے نیند کی نعمت سے محروم کر دیا ہے۔ میں سونے کی ہر کوشش کر چکا ہوں، غذا میں تبدیلی، ادویات کا استعمال، دم جھاڑ، نفسیاتی معالجین سے علاج، مگر کوئی بھی طریقہ کامیاب نہ ہوا۔ میں آج تک اس نعمت سے محروم ہوں۔'' پروفیسر غلام سرور کہنے لگے: اس واقعہ کو سننے کے بعد اس سفر کے دوران میری آنکھوں سے بھی نیند دور ہو چکی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ظالموں پر اپنی کتاب مقدس میں لعنت فرمائی ہے۔ (ھود 18:11) جب تک وہ مظلوم اس کو معاف نہ کرے گا، اللہ تعالیٰ بھی تب تک اسے معاف نہیں کرے گا۔

''دیر'' کے علاقے میں قرآن وسنت کی روشنی

2 کنال پر مشتمل جامعہ محمدیہ اہل حدیث (دیر شہر) تعمیر کے آخری مراحل میں ہے۔ آپ بھی اپنا حصہ ڈالیے۔

فوری طور پر تعاون کی اشد ضرورت ہے۔



رقم یا میٹریل کی صورت میں ضرور تعاون کریں۔

منجانب جامعہ محمدیہ اہل حدیث:

AC No: 1639-3 ABL Dir 0622

جمال منیجر: 0303-8623643. 0342-9638213

حاجی گل عارف 0334-9322582

عبدالغفار پٹواری 0302-5996989



ڈاکٹر بشریٰ تسنیم
(شارجہ)

یادیں کتنی عجیب شے ہوتی ہیں۔ یہ اللہ رب العزت کے عجائبات میں سے ایک عجوبہ ہیں۔ یہی اداس کرتی ہیں، خوش کرتی ہیں، شرمندہ کرتی ہیں، فخر و غرور کا احساس دلاتی ہیں، شکر کے جذبات پیدا کرتی ہیں، فکر کی جولان گاہ میں لے جا کر کبھی مضمحل و بے کار کر دیتی ہیں، کبھی عمل پہ ابھارتی ہیں، قرب کا باعث بنتی ہیں تو کبھی دوری کا احساس دلاتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ یادیں ظالم بھی ہیں مہربان بھی، کانٹے بھی ہیں پھول بھی، تلخ بھی ہیں شیریں بھی۔ ایک انسان ہے اور اس کی یادیں لا متناہی، زندگی کا رخ بدلتا جاتا ہے تو یادوں کا رخ بھی بدلتا جاتا ہے۔ ایک ہی مقام پہ بیٹھا انسان کبھی صحرا میں ہے تو کبھی نخلستان میں، کبھی اندھیرے میں تو کبھی اجالے میں۔

یادوں کا سفر ایسا ہے جیسے اونٹوں کی لمبی قطار جن کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے، ہر اونٹ پر یادوں کا سامان لدا ہے۔ کہیں حسرتوں کے تھیلے لٹک رہے ہیں، کہیں خوشیوں کی پوٹلیاں۔ لگتا ہے اونٹ کے کجاوے پہ دونوں طرف حسرتوں، پشیمانیوں اور خوشیوں کے تھیلے توازن کے ساتھ رکھ دیے گئے ہیں۔ اللہ رب العزت نے دکھ اور سکھ کی برابر میزان کے ساتھ انسانی زندگی کو وقت کے کجاوے میں ڈال دیا ہے۔ پھول کے ساتھ کانٹا ہے کہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ سکھ کے ساتھ دکھ ہے کہ سکھ کی پہچان قائم رہے۔ دنیا کے الم بھی خوشیوں کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ رات نہ ہوتی تو دن کا اجالا کس کو اہم لگتا، دن کی مشقت نہ ہوتی تو رات کا آرام و سکون کس کو نعمت لگتا، بیماری میں صحت کی قدر کا احساس نہ جاگتا، زندگی بھی کبھی دن ہے کبھی رات۔ کبھی دھوپ ہے کبھی چھاؤں۔ انسان ہر لحہ کسی نہ کسی سوچ، فکر اور یاد میں مبتلا رہتا ہے۔ گویا انسان یادوں کے سہارے جیتا ہے۔ اپنے گزرے وقت کی غلطیوں کو یاد کر کے اصلاح کرتا ہے۔ منصوبہ بندی کرتا ہے اور آگے بڑھتا ہے۔ ماضی کی یادیں اصلاح کرتی ہیں، مستقبل کے اندیشے اور خیالات منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ گزرے وقت کی یادیں انسان کو خوش کرتی ہیں یا اداس۔ جو وقت گزر گیا وہ اپنے نقوش اور یادوں کی شکل میں قائم و دائم رہتا ہے۔ صحت، جوانی، مال اور اولاد وقت کے ساتھ ساتھ اپنی دسترس سے نکلتے جاتے ہیں۔ ساری جاہ و حشمت، دولت اور آسائشوں کے سروسامان بے وقعت ہوتے جاتے ہیں۔ بس ان کی یادیں رہ جاتی ہیں جیسے تتلیوں کے رنگ مٹھی میں رہ جائیں۔ انواع و اقسام کے کھانوں کے ذائقے یاد ہیں مگر اب ان پہ کھانے کا حق ختم ہو گیا ہے۔ یہ دنیا اور اس کے سب سروسامان موت سے پہلے ہی ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں۔ اب یادیں ہیں اور ایک بستر کا مالک۔ یادیں بھی اس صورت میں اگر یادداشت بھی وفا کرے تو ....., قبر وہ مقام ہے جہاں یادیں ہی یادیں ہوں گی، قیامت تک اس کو اپنے اچھے یا برے اعمال یاد آتے رہیں گے، دکھائی دیتے رہیں گے اور وہ ان گزرے اعمال و لمحات کی مناسبت سے اپنی روح کو شاد کام کرتا رہے گا یا پھر روح کی ناخوشی کا عذاب سہتا رہے گا۔ ایک وہ وقت بھی آئے گا جب اپنے رب کے حضور کھڑا ہو گا اور اپنے ہر عمل کی یاد سرخرو کر رہی ہو گی یا پھر ندامت کے پسینے میں ڈبکیاں کھاتے ہوئے دنیا میں واپس جانے کی خواہش مچل رہی ہو گی، تا کہ وہ ان بری یادوں کو ختم کر کے کوئی اچھی، دل خوش کن، رب کو راضی کرنے والے اعمال کی یادوں کا ذخیرہ لا سکے۔



پیشۂ تجارت

حافظ عبدالسمیع، ریسرچ فیلو دارالسلام

آج عمومی طور پر میرے فہم کے مطابق معاشی میدان میں اہل علم و دانش پیش پیش نہیں ہیں۔ اس کی ایک بنیادی وجہ بعض حضرات کی یہ سوچ ہے کہ خرید وفروخت کے مسائل میں اہل علم کو نہیں پڑنا چاہیے اور یہ کام ان کی شان کے خلاف ہے۔

یاد رکھیے! جس طرح صرف دنیا کی طلب و حرص ناپسندیدہ ہے۔ اسی طرح دنیا کو بالکل چھوڑ دینا اور دنیاوی مشاغل میں مصروف ہونے کو اپنی وجاہت کے خلاف سمجھنا بھی سنگین غلطی ہے۔

محترم قارئین! اسلامی تعلیم تو یہ ہے: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ ''اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔'' (البقرة 201:2)

وہ لمحات کس قدر حسین اور دلربا ہوں گے کہ ایک عالم دین اپنی منصبی اور تبلیغی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے ادا کرے اور معاشی طور پر وہ نہایت مضبوط اور مستحکم ہو۔

ذیل میں ہم جائزہ لیتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے تعلیمی و تبلیغی اور منصبی فرائض کی ادائیگی کے ساتھ تجارت، زراعت اور معاشی میدان میں سرگرم رہا کرتے تھے یا نہیں؟

① شروع اسلام میں مسلمان ایک دوسرے کو تلاش معاش، کسب حلال، کاروبار اور تجارت کی ترغیب دلایا کرتے تھے اور بے کاری، غلط توکل اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے بچایا کرتے تھے۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ کام کرنا چاہیے، دوسروں کے بھروسے پر نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ایک موقع پر رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ أَطْيَبَ مَاأَكَلْتُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ» ''سب سے پاکیزہ کھانا وہ ہے جو تم اپنی کمائی سے کھاتے ہو۔'' (جامع الترمذي: 1358) ایک اور موقع پر فرمایا: کسی نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کھانا کبھی نہیں کھایا اور اللہ تعالیٰ کے نبی (سیدنا) داود علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔ (صحيح البخاري: 2072)

ایک حدیث میں ہے: «إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِيَّ الْغَنِيَّ الْخَفِيَّ» ''اللہ تعالیٰ ایسے بندے سے محبت کرتا ہے جو پرہیز گار، غنی اور گوشہ نشین ہو۔'' (صحيح مسلم: 2965)

نبی اکرم ﷺ نے تاجروں کے متعلق مزید فرمایا: ''سچا، امانت دار تاجر (قیامت کے دن) انبیاء، صدیقین اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔'' (جامع الترمذي: 1209)

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ: رسول اللہ ﷺ کے نہایت قریبی ساتھی، سفر وحضر کے رفیق، خلیفۂ رسول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تجارت پیشہ تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے بغرض تجارت ملک شام کے کئی سفر کیے، آپ رضی اللہ عنہ کپڑے کی تجارت کیا کرتے تھے۔

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ: اسلام کی نہایت ممتاز شخصیت جن کے عدل و انصاف اور تقویٰ و خشیتِ الٰہی کا عام چرچا ہے۔ ان کا ذریعہ معاش تجارت ہی تھا مگر مدینہ منورہ پہنچ کر آپ رضی اللہ عنہ نے زراعت بھی شروع کر دی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ کا تجارتی مشغلہ اگرچہ ابتدائی ایام خلافت میں رک گیا تھا مگر بعد میں آپ نے اسے پھر جاری کر دیا تھا اور آپ کی تجارت کی شاخیں ایران تک پہنچ گئی تھیں۔ (الطبقات لابن سعد: 199/3)



سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ: رسول اللہ ﷺ کی دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے ان کے نکاح میں آئیں، اسی لیے آپ رضی اللہ عنہ کو ذوالنورین کہا جاتا ہے۔ خلیفہ سوم سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ بہت بڑے تاجر تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی دولت اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر رکھی تھی اور ہر کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔

سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ: سیدنا عبدالرحمٰن عوف رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، انھیں رسول اللہ ﷺ نے زندگی میں جنت کی بشارت دی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ کو تجارت کا بہت شوق تھا، چنانچہ مدینہ منورہ پہنچتے ہی آپ نے ایک معمولی دکان کھولی۔ اللہ رب العزت نے اس میں خوب برکت اور وسعت دی، اور یہ امیر ترین صحابہ کرام میں شامل ہو گئے۔ ہر کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔

سیدنا زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ: سیدنا زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے داماد تھے۔ بہادری اور شجاعت میں سب ان کا لوہا مانتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا ابتدائی ذریعہ معاش تجارت نہیں تھا مگر تجارت کے فضائل و محاسن سے آگاہ ہونے کے بعد آپ تجارت سے وابستہ ہو گئے۔ اور نہایت اعلیٰ پیمانے پر تجارت کیا کرتے تھے، ان کا زہد و تقویٰ کمال درجے کا تھا، آپ کے کافی غلام تھے، اس کے علاوہ روزانہ اجرت پر کام کرنے والے ہزار کے قریب افراد تھے، عجیب بات یہ ہے کہ آپ کے غلام شام کو جو کچھ کما کر لاتے، آپ وہ سب کا سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا کرتے تھے۔(الإصابة: 557/2)

سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ: سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے ان کی زندگی میں ہی انھیں جنت کی بشارت دے دی تھی، آپ کو بھی تجارت کا بہت شوق تھا، انھوں نے تجارت کے سلسلہ میں دور دراز ملکوں کا سفر کیا، ماشاء اللہ نہایت کامیاب تاجر تھے۔ بڑے سخی اور فیاض تھے، فقراء اور مساکین کے لیے آپ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ ''بیسان مالح'' ایک چشمہ تھا، جسے آپ نے خرید کر وقف کر دیا تھا۔(الإصابة: 529/3)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ: سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے خادم خاص تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں ایک موقع پر یہ دعا دی: «اَللّٰهُمَّ أَكْثِرْ مَالَهُ وَوَلَدَهُ وَبَارِكْ لَهُ فِيمَا أَعْطَيْتَهُ» ''اے اللہ اس کے مال اور اولاد میں فراوانی عطا فرما اور اسے جو کچھ تو نے دیا ہے اس میں برکت پیدا فرما۔'' اللہ تعالیٰ نے انھیں خوب برکت سے نوازا، ان کی اولاد بھی خوب ہوئی اور مالی حالت بھی بہترین رہی، رسول اللہ ﷺ کی دعا کا یہ اثر تھا کہ انھوں نے زندگی نہایت خوشحالی سے گزاری، مزاج میں نفاست اور پاکیزگی تھی، قیمتی لباس پہنا کرتے تھے۔ اچھے سے اچھا کھاتے، خوشبو بکثرت استعمال کرتے تھے۔ ان کے 8 7 بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔(الاستيعاب في معرفة الأصحاب:35/1)

محترم قارئین! اسلام نہایت پاکیزہ اور عالم گیر مذہب ہے، اس کا دائرہ عمل نہایت وسیع ہے۔ اگر کسی مذہب میں دین اور دنیا کا حسین امتزاج ہے تو وہ اسلام ہے۔

افسوس یہ ہے کہ اسلام کے پیروکار خود ساختہ اصولوں اور قوانین کے پابند ہو رہے ہیں اور اسلامی تعلیمات سے کنارہ کش ہوتے جا رہے ہیں اب ہمیں اپنے آپ کو بدلنا چاہیے۔ حقائق کو نظر انداز کر کے خوابوں کے جہاں میں گھومنا پھرنا چھوڑ دینا چاہیے۔

معاشی میدان میں بے راہ روی کا نتیجہ ہمارے سامنے معاشی بحران، خانہ جنگی، قتل و غارت، چوری، راہزنی اور معاشرے میں بے سکونی کی صورت میں واضح ہے۔

اسلام کے عادلانہ معاشی نظام کی خوبیاں دیگر اقوام کے سامنے تب ہی نمایاں ہو سکیں گی۔ جب کوئی ان پر عمل کرنے والا ہوگا۔

ذرا دیکھیے! ہمارے اصول و قوانین کتنے عمدہ ہیں؟ اور کس قدر پیارا ہمارا معاشی نظام ہے!

① حلال و حرام میں امتیاز:

معاشی جدوجہد کی ترغیب دی گئی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی شرط لگا دی گئی ہے کہ آمدنی جائز ذرائع سے حاصل کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''حرام رزق سے پرورش پانے والا جسم جنت میں داخل نہیں ہو گا۔''(الترغيب والترهيب: 114)

② زکوٰۃ کی ادائیگی

زکوٰۃ اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے اور معاشرے میں معاشی عدل کا اہم ذریعہ ہے۔ یہ نظام پورے معاشرے سے بخل، تنگ دلی، خودغرضی، بغض، حسد کو ختم کر کے محبت، ایثار، احسان، خلوص، خیر خواہی اور تعاون کے جذبات کو فروغ دیتا ہے۔



③ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی اللہ کے دیے ہوئے مال کو غرباء، مساکین اور دیگر ضرورت مندوں پر خرچ کرنا چاہیے۔ حدیث میں ہے: ''زمین پر ہر روز دو فرشتے اترتے ہیں، ان میں سے ایک کہتا ہے: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرما، اور دوسرا کہتا ہے: اے اللہ! روک کر رکھنے والے کے مال کو ضائع فرما۔'' (صحیح البخاري: 1374)

④ ادائیگی قرض کا احساس

کوئی ملک یا معاشرہ، خواہ وہ پس ماندہ ہو یا ترقی یافتہ، قرض اس کی معاشیات کا ہمیشہ سے اہم جزو رہا ہے۔ قرض حسنہ محتاج اور کئی صورتوں میں امیر شخص کا بھی بہت بڑا سہارا ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اپنی ذاتی ضروریات اور محتاجوں کی کفالت کے لیے کئی بار قرض حسنہ لیا۔ مگر اس قرض کی ادائیگی کا جتنا احساس آپ کو ہوتا اور جتنا اس کی ادائیگی کا انتظام فرماتے۔ وہ قرض لینے والوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

⑤ سرکاری خزانہ کا استعمال بطور امانت

- ذخیرہ اندوزی کی ممانعت
- تجارت میں باہمی رضامندی
- اسلام صاف ستھری تجارت کی ترغیب دیتا ہے۔ اسلام میں کسی کی سادہ لوحی یا مجبوری سے ناروا فائدہ اٹھانے کی سخت ممانعت ہے۔

⑦ دیانت وصداقت

نبی کریم ﷺ نے کاروبار میں دیانت و صداقت کی تلقین فرمائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی انھی صفات کی بنا پر صادق وامین کے لقب سے مشہور ہوئے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''بہترین کسب بیع مبرور ہے۔'' (مسند احمد: 141/4)

بیع مبرور ایسے کاروباری معاملے کو کہتے ہیں جس میں فریقین ایک دوسرے سے تعاون اور بھلائی کا معاملہ کریں، یعنی نہ اس میں خیانت ہو، نہ دھوکا ہو اور نہ اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی ہو۔

⑧ خوش خلقی اور نرمی

رسول اللہ ﷺ نے تجارت میں اعلیٰ حسن اخلاق، نرم مزاجی اور حسن معاملہ کی تاکید کی ہے، درشتی اور بد مزاجی سے روکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو بیچنے، خریدنے اور قرض کا تقاضا کرنے میں آسانی کرے۔

(صحیح البخاري: 1970)

⑨ دھوکا دہی کی ممانعت

بعض تاجر نفع کمانے کے لالچ میں اچھی چیز دکھا کر سودا کرتے ہیں، لیکن گاہک کو خراب چیز دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی مذمت فرمائی ہے:

اسلام کی معاشی حکمت عملی ایسے عادلانہ اور منصفانہ اصولوں پر مبنی ہے جس میں ہر انسان کی معاشی، معاشرتی اور اخلاقی ترقی و بہبود کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ ان اصولوں پر عمل کرنے سے افراد معاشرہ نہ صرف دنیا کی خوشحالی سے سرفراز ہوں گے بلکہ اخروی کامیابی بھی ان کا مقدر ہو گی۔ ان شاء اللہ

محترم قارئین! اسلام کے معاشی نظام میں کتنی خوبصورتی ہے، لیکن اس پر عمل کون کرے گا؟ اندھیرے کو بھگانے کے لیے شمعیں کون جلائے گا، معاشی ظلم وستم کو ختم کرنے کے لیے عدل وانصاف کا ترازو کون پیش کرے گا۔

آیئے! ایک مسلمان تاجر کی حیثیت سے دنیا بھر کے گندے معاشی نظام کو ختم کریں اور اسلام کے صاف ستھرے، پاکیزہ معاشی نظام کی ترویج کریں۔

یاد رکھیے! یہ وقت کی پکار ہے۔ جو قوم اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہو جانا سیکھ جاتی ہے اسے دنیا کی کوئی طاقت تباہ و برباد نہیں کر سکتی اور جو قوم اپنے خالق و مالک سے خفا ہو، اس کی ناشکری کرے، تو ایسی قومیں خسارے سے نہیں بچا کرتیں، یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ بھرپور محنت اور لگن سے کام کرتے ہیں اور اپنے اللہ سے خوبصورت اور بہترین امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں تو ہمیشہ کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔

آج ہمیں دیگر اقوام کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو ہر میدان میں مضبوط و مستحکم کرنا پڑے گا، جو قوم اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو، معاشی حالت بہتر ہو، اس کے پاس افرادی طاقت موجود ہو تو اس کا دشمن پر رعب ہوتا ہے۔ ورنہ وہی ہوتا ہے جو ہو رہا ہے۔ اللہ پاک ہم سب کے حال پر رحم فرمائے۔ آمین



حق پہچان کر تسلیم نہ کرنا

حافظ عبدالوحید سوہدروی

الحمد للّٰہ والصلٰوۃ والسلام علٰی رسول اللّٰہ۔ اما بعد

اکثر لوگوں کی عادت بن چکی ہے کہ کسی امر کے بارے میں حقیقت حال جان کر بھی اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اور پھر اپنے اس فعل کو برا بھی نہیں سمجھتے۔ یہی وہ عادت ہے جو انسان کو یہود کے قریب کرتی جاتی ہے۔ یہود میں منجملہ دیگر بدخصلتوں کے ایک یہ بھی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا سچا پیغمبر جان کر بھی ایمان نہیں لائے۔ اپنی نجی محفلوں میں وہ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ یہ وہی پیغمبر ہے جس کی بشارت ہماری کتاب میں دی گئی ہے۔ مگر ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے ایمان نہیں لائے کہ یہ پیغمبر عرب ہے یہود میں سے کیوں نہیں آیا۔ اللہ پاک فرماتے ہیں: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ ”جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اسے (محمد ﷺ کو) اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، ہاں جن لوگوں نے اپنے آپ کو خسارے میں رکھا وہ ایمان نہیں لائیں گے۔“ (الانعام 20:6)

جس طرح کوئی شخص اپنے بیٹے کو پہچاننے میں ہزاروں لاکھوں کے مجمع میں بھی غلطی نہیں کرسکتا اسی طرح یہود نے بھی محمد ﷺ کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ یہ تو صرف ان کی ضد تھی جو آڑے آئی۔

آیئے اب چند تاریخی حوالوں سے اس بات کا ثبوت ملاحظہ کرتے ہیں کہ یہود کے علماء اور سیاسی لیڈر رسول اللہ ﷺ کو اپنی نجی محفلوں میں سچا نبی مانتے تھے۔

| پہلا ثبوت |

یہ ایک یہودی قبیلہ بنونضیر کے سردار حُیَیّ بن اَخْطَبْ کی سن بلوغت کو پہنچنے والی بیٹی ہے جو بیان کرتی ہے کہ میں اپنے بہن بھائیوں میں اپنے والد اور چچا ابو یاسر کی بہت چہیتی تھی۔ جب محمد ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو میرے والد اور چچا صبح سویرے ہی ان کو ملنے کے لیے چلے گئے۔ اور بڑی دیر کے بعد واپس لوٹے۔ ان کے آنے پر میں نے دیکھا کہ دونوں چپ چاپ اور بڑے افسردہ ہیں۔ مجھ سے بھی وہ فری ہوکر بات نہ کرتے۔ تھوڑی دیر بعد میرے چچا ابو یاسر نے میرے والد حُیَیّ بن اَخْطَبْ سے پوچھا: «أَهُوَ هُوَ» ”کیا یہ وہی پیغمبر ہے؟“ (جس کا ذکر ہماری کتاب میں ہے) والد نے جواب دیا: «نَعَمْ» ”ہاں“ (یہ وہی ہے) چچا نے کہا: ذرا سوچ سمجھ کر جواب دو، کیا یہ وہی ہے؟ والد نے کہا: ہاں وہی ہے۔ چچا نے پوچھا: پھر آپ کا کیا پلان ہے؟ باپ نے جواب دیا: میں تو اس کی مخالفت کروں گا۔

حضرات! دیکھا آپ نے کتنا واضح مکالمہ ہے دونوں بھائیوں کا اور یہ واقعہ بیان کرنے والی گھر کی بھیدی وہ معصوم لڑکی ہے جس کا نام صفیہ بنت حُیَیّ ہے۔ اسی واقعہ سے متاثر ہوکر وہ اسلام سچا مذہب سمجھنے لگی اور خیبر فتح ہونے کے بعد وہ از خود مسلمان ہوگئی۔ قبول حق پر باری تعالیٰ نے اسے اتنا بڑا انعام دیا کہ جنگی قیدی بننے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اسے آزاد کرکے اس سے نکاح کرلیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے ام المومنین جیسے اعلیٰ مقام پر



فائز فرما دیا۔ سبحان اللہ! حق کو تسلیم کر لینے والے اس دنیا میں بھی فائز المرام ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی ان کی کامیابی کا وعدہ اللہ پاک بلاشبہ پورا کریں گے۔

یہاں ضمناً ایک واقعے کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جس کا تعلق اگرچہ ہمارے موضوع سے تو نہیں البتہ ام المومنین سیدہ صفیہ ؓ سے ضرور ہے۔ وہ یہ کہ جب رسول اللہ ﷺ کی سیدہ صفیہ سے خلوت میں ملاقات ہوئی تو آپ ﷺ نے ان کے چہرہ پر ضرب کا نشان دیکھ کر دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ سیدہ صفیہ ؓ نے بتایا کہ میں نے خواب دیکھا تھا کہ آسمان سے چاند میری گود میں آگرا ہے۔ میں نے یہ خواب جب اپنے خاوند کو سنایا تو اس نے غصہ میں آکر زور سے مجھے تھپڑ مارا اور کہا کہ تو عرب کی ملکہ بننا چاہتی ہے۔ (اشارہ تھا کہ نبی اکرم ﷺ سے شادی کرنا چاہتی ہے) کہتی ہیں کہ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔

اس واقعہ سے درج ذیل مسائل مستنبط ہوتے ہیں: ① کافر کا خواب بھی سچا ہوسکتا ہے کیونکہ سیدہ صفیہ ؓ اس وقت مسلمان نہیں تھیں۔ جب کافر کا خواب سچا ہوسکتا ہے تو پھر ایک گنہگار مسلمان کا بھی ہو سکتا ہے۔ ② قرآن نے سچ فرمایا کہ تم میں سے بعض (سب نہیں) میاں بیوی ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ ③ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ برا خواب کسی سے بیان نہ کرو اور اچھا خواب صرف عالم آدمی یا اپنے محبوب سے بیان کرو۔ بیوی کے لیے خاوند بھی تو محبوب ہوتا ہے۔ تب ہی تو سیدہ صفیہ ؓ نے اسے خواب سنایا۔ مگر اس نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنی بیوی کا دشمن تھا۔ ④ یہودی خاوند صاحب علم معلوم ہوتا ہے جو خواب سنتے ہی اس کی تعبیر جان گیا۔ ⑤ اچھا برا خواب دیکھنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ لہٰذا خواب دیکھنے والے کو موردِ الزام ٹھہرانا بیوقوفی ہے۔ سیدہ صفیہ ؓ کا سابقہ خاوند صاحب علم بھی ہوگا لیکن بے وقوف ضرور تھا۔

دوسرا ثبوت

رسول اللہ ﷺ نے اپنے کمال سیاسی تدبر کا ثبوت دیتے ہوئے مکہ سے ہجرت کر کے آنے کے بعد پہلے ہی سال میں مدینہ میں بسنے والے یہود کے تینوں قبائل: بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ سے ایک معاہدہ کیا جسے میثاق مدینہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس میں ایک شق یہ بھی تھی کہ بوقت ادائیگی دیتِ قتل یہود اور مسلمان ایک دوسرے سے مالی تعاون کریں گے۔ معاہدہ کے چار سال یعنی جنگ احد کے بعد ایک مسلمان سے غلطی کے ساتھ دو کافر معاہد قتل ہو گئے اور مسلمانوں کو ایک سو اونٹ فی مقتول کے حساب سے دیت دینا لازم آئی۔ رسول اللہ ﷺ چند صحابہ کو ساتھ لے کر بشمول ابوبکر و عمر ؓ یہود کے قبیلہ بنی نضیر کے ہاں گئے جو مدینہ کے باہر جنوب کی طرف آباد تھے اور ان سے اسی معاہدہ کے تحت مالی تعاون کا مطالبہ کیا۔ جس پر انھوں نے نبی اکرم ﷺ کو ایک مکان میں بیٹھا کر انتظار کرنے کے لیے کہا کہ ہم رقم اکٹھی کرتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ مکان کے صحن میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ یہود نے اندر جا کر خفیہ میٹنگ کی کہ کیوں نہ محمد (ﷺ) کو چھت سے چکی کا پاٹ (گول پتھر) گرا کر ہلاک کر دیا جائے، اس طرح ان سے ہماری خلاصی بھی ہوجائے گی اور رقم دینے سے بھی بچ جائیں گے۔ اور حاضرین سے پوچھا کہ یہ کام کون کرے گا۔ ان میں سے ایک بدبخت عمرو بن جحاش نے حامی بھرلی۔ اس موقع پر موجود یہود کے ایک عالم سلام بن مشکم نے یہودیوں سے کہا کہ ایسا نہ کرو۔ محمد ﷺ کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی مطلع کر دیا جائے گا۔ نیز یہ بات میثاق مدینہ کے بھی خلاف ہے مگر یہودی نہ مانے۔ دوسری طرف رسول اللہ ﷺ وحی کے ذریعے مطلع ہونے کے فوراً بعد وہاں سے اٹھ کر صحابہ کو بتائے بغیر مدینہ کی طرف چل دیے۔ جب مدینہ کے قریب صحابہ کرام نبی پاک ﷺ سے آن ملے تو آپ نے ان کو صورت حال سے آگاہ فرمایا۔ یہی واقعہ بنو نضیر کی مدینہ بدری کا سبب بنا۔

قارئین کرام! یہود کے عالم سلام بن مشکم کا یہودیوں کو اس بنا پر روکنا کہ محمد ﷺ کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی پتہ چل جائے گا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اسے آپ کی نبوت اور نزول وحی کا یقین تھا۔ مگر اللہ نے اسے ایمان لانے کی توفیق نہ دی۔

تیسرا ثبوت

یہی قبیلہ بنو نضیر جب مدینہ سے نکال دیا گیا تو خیبر میں جا کر آباد ہو گیا۔ مگر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں میں کوئی کمی



نہ آئی حتی کہ غزوۂ خندق کے دوران اس نے قریش کا نہ صرف خود ساتھ دیا بلکہ ایک قدرے شریف یہودی قبیلہ بنو قریظہ کو، جو اپنی شرافت کی وجہ سے ابھی تک مدینہ میں آباد تھا، مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ میں شامل ہونے کے لیے آمادہ کرلیا۔ یہ بہت بڑا جرم تھا جو بنو قریظہ کی فوری تباہی کا سبب بن گیا۔ تاہم نبی اکرم ﷺ نے اپنے سیاسی تدبر کے تحت بنونضیر سے نبٹنا حدیبیہ کی صلح ہوجانے تک مؤخر کردیا۔ جس کے بعد ان پر چڑھائی کر کے اللہ کی مدد سے خیبر فتح کرلیا۔ فتح کے بعد ایک یہودی عورت نے صحابہ کرام سے رسول اللہ ﷺ کی پسند معلوم کر کے بکری کا دستہ بھونا اور اس میں زہر ملا کر آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ نبی اکرم ﷺ کسی کی دعوت مسترد نہیں کرتے تھے۔ آپ نے صحابہ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا شروع کیا۔ پہلا لقمہ منہ میں رکھتے ہیں مگر آپ نے اسے تھوک دیا اور صحابہ کو زہر کی ملاوٹ کا بتا کر کھانے سے روک دیا۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ جو بھی یہودی اردگرد ہوں انھیں اکٹھا کرو۔ ان کے آنے پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ایک بات تم سے پوچھتا ہوں سچ سچ بتاؤ گے؟ کہنے لگے: کیوں نہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: تمھارا باپ کون ہے؟ انھوں نے ایک نام لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم جھوٹ بولتے ہو، تمھارا باپ تو فلاں شخص ہے۔ کہنے لگے: «صَدَقْتَ وَبَرِرْتَ» ''آپ نے سچ اور صحیح کہا۔'' آپ نے پھر کہا میں ایک اور بات پوچھتا ہوں سچ بتاؤ گے؟ کہنے لگے: کیوں نہیں اے ابوالقاسم۔ تم نے باپ کا پوچھا تو ہمارے غلط جواب کا تمھیں پتہ چل گیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ جہنم والے کون لوگ ہیں؟ کہنے لگے کہ ہم چند دنوں کے لیے جہنم میں جائیں گے اس کے بعد تم لوگ (مسلمان) ہماری جگہ لے لو گے۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: ''تم ذلیل ہوجاؤ بدبختو! خدا کی قسم! ہم جہنم میں تمھاری جگہ ہرگز نہیں لیں گے۔'' آپ ﷺ نے پھر فرمایا: ''میں ایک اور بات تم سے پوچھتا ہوں، سچ بتاؤ گے؟'' کہنے لگے کیوں نہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''اس گوشت میں زہر تم نے ملایا تھا؟'' اب کی بار سچا جواب دیتے ہیں کہ ہاں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: کیوں؟ کہنے لگے: ہم نے سوچا کہ اگر تم سچے نبی ہوئے تو تمھیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا ورنہ ہماری جان تم سے چھوٹ جائے گی۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کے سچا جواب دینے پر انھیں معاف کردیا۔ (صحيح البخاري: 3169)

قارئین! غور کیجیے کہ ان کی اپنی ہی اختیار کردہ کسوٹی کے مطابق نبی اکرم ﷺ نعوذ باللہ ہلاک نہیں ہوئے۔ اب تو ان کو ایمان لے آنا چاہیے تھا۔ نبوت کی اتنی بڑی دلیل دیکھ کر ایمان نہ لانا ضد اور ہٹ دھرمی نہیں تو کیا ہے؟

چوتھا ثبوت

غزوۂ خندق کے بعد قریش اور دوسرے کفار کا ساتھ دینے پر مدینہ میں بسنے والے یہود کے قبیلہ بنو قریظہ کا مسلمانوں نے محاصرہ کر لیا، دس بارہ روز گزر جانے کے بعد قبیلہ کے سردار کعب بن اسد نے یہود کو اکٹھا کر کے جان بچانے کے لیے ان کے سامنے تین تجاویز رکھیں۔ سب سے پہلی تجویز یہ تھی کہ مسلمان ہو جاؤ۔ اس طرح تمھاری جانیں، مال اور اولاد سب کچھ بچ جائے گا۔ اور تم پر واضح بھی ہو چکا ہے کہ یہ وہی نبی برحق ہے جس کی بشارت تم اپنی کتاب میں پاتے ہو۔ یہود نہ مانے۔ دوسری تجویز رکھی کہ اپنے ہاتھوں سے اپنے بیوی بچوں کو قتل کر کے بے جگری کے ساتھ مسلمانوں سے لڑائی کرو۔ یہ تجویز بھی نہ مانی۔ تیسری تجویز رکھی پھر مسلمانوں کو دھوکا دے کر ہفتہ کے روز ان پر حملہ کر دو۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہم ہفتہ کے روز صرف عبادت کرتے ہیں اور وہ لڑائی سے غافل ہوں گے۔ یہ تجویز بھی نہ مانی جانے پر ان کے سردار نے جھنجھلا کر کہا کہ میں نے تم میں سے ایک بھی آدمی ایسا عقلمند نہیں پایا جس نے ایک رات بھی سمجھداری سے گزاری ہو۔ (ماخوذ از تیسیر القرآن: 575/3)

قارئین کرام! کعب بن اسد کی پہلی تجویز نبی اکرم ﷺ کو سچا نبی سمجھنے کا کتنا بڑا ثبوت ہے جس کا برملا اقرار قبیلہ کا سردار اپنے عوام کے سامنے کر رہا ہے۔ لیکن قسمت میں ایمان نہ لکھا ہو تو دوسرے کیا کر سکتے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ

اللہ پاک کے ہاں بے انصافی ہرگز نہیں۔ بعض یہودیوں کی خدا نے قرآن پاک کے کئی مقامات پر تعریف بھی کی ہے۔ جیسے سورت آل عمران کی آیت نمبر 113 تا 115 میں فرمایا: ''یہ لوگ سب برابر نہیں۔ اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو حق پر قائم ہیں۔ رات کی گھڑیوں میں اللہ کی کتاب (تورات) کی



تلاوت کرتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں (تہجد گزار ہیں) اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں۔ یہی لوگ کامیاب ہیں۔ یہ لوگ جو بھی نیکی کا کام کرتے ہیں اس کی بے قدری ہرگز نہیں کی جائے گی۔ اللہ تو سینے کے رازوں کو بھی خوب جانتا ہے۔" (آل عمرٰن 3:113-115)

جن اہل کتاب میں یہ خوبیاں پائی جاتی تھیں وہ نبی اکرم ﷺ پر ایمان لا کر مسلمان ہو گئے۔ البتہ انھوں نے ایمان لانے سے پہلے آپ کی صداقت کا امتحان ضرور لیا تھا۔ چنانچہ یہود کے دو عالموں کے ایمان لانے کا قصہ ملاحظہ ہو۔

پانچواں ثبوت

عبداللہ بن سلام یہودیوں کے بہت بڑے عالم تھے۔ نبی اکرم ﷺ کے مدینہ پہنچنے کی خبر انھیں اس وقت ملی جب وہ اپنے باغ میں پھل توڑ رہے تھے۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سیدھے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر تین سوال پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کا جواب ماسوائے نبی کے اور کوئی نہیں جانتا۔ پہلا سوال یہ ہے کہ قیامت کی سب سے پہلی نشانی کیا ہوگی۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ جنتیوں کا سب سے پہلا کھانا کیا ہوگا اور تیسرا سوال یہ ہے کہ بچہ کبھی باپ پر اور کبھی ماں پر کیوں جاتا ہے؟ نبی پاک ﷺ نے کہا کہ ابھی میرے پاس جبریل علیہ السلام نے آ کر مجھے بتایا ہے کہ قیامت کی پہلی نشانی ایک آگ ہوگی جو مشرق سے سلگے گی اور لوگوں کو مغرب کی طرف دھکیلتی جائے گی۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جنتیوں کا سب سے پہلا کھانا مچھلی کی کلیجی ہوگا اور تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میاں بیوی کی مجامعت کے وقت اگر باپ کا انزال غالب آجائے تو بچہ باپ پر اور اگر ماں کا غالب آجائے تو بچہ ماں پر جاتا ہے۔ جواب سنتے ہی عبداللہ بن سلام کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتے ہیں۔ پھر نبی اکرم ﷺ کو یہودیوں کی ایک عادتِ بد، یعنی بہتان تراشی سے آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انھیں میرے مسلمان ہونے کا بتائے بغیر میرے بارے میں پوچھیے۔ تھوڑی دیر بعد دیگر یہود آ گئے اور عبداللہ بن سلام پیچھے کمرے میں چھپ گئے۔ نبی ﷺ نے یہودیوں سے عبداللہ بن سلام کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیسا آدمی ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ وہ بہت بڑا عالم اور عالم کا بیٹا ہے۔ ہمارا سید ہے اور سید زادہ ہے۔ گویا تعریف کی۔ نبی کریم ﷺ نے کہا: اگر وہ مجھ پر ایمان لے آئے تو؟ یہودیوں نے جواب دیا: معاذ اللہ، اللہ اسے مسلمان ہونے سے محفوظ رکھے۔ اتنے میں عبداللہ بن سلام کمرے سے باہر آ کر سب کے سامنے کلمہ پڑھتے ہیں۔ یہ دیکھتے ہی ان کی تعریف گوئی فوراً مذمت میں بدل گئی کہ یہ ہم سب سے کمینہ، کمینے کا بیٹا اور بہت برا آدمی ہے۔ عبداللہ بن سلام نے نبی پاک ﷺ سے کہا کہ میں نے آپ سے درست کہا تھا نا۔ (صحیح البخاری: 3329)

چھٹا ثبوت

امام بیہقی دلائل النبوہ میں ایک واقعہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی زبانی بتاتے ہیں کہ فلاں یہودی عالم نبی اکرم ﷺ سے اپنے چند دینار قرض کا تقاضا کرنے آیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "اے یہودی! میرے پاس قرض اتارنے کے لیے ابھی کچھ نہیں۔" اس نے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ میں تو اپنی رقم لیے بغیر نہیں جاؤں گا اور تم سے جدا نہیں ہوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر میں تیرے ساتھ ہی بیٹھا رہوں گا۔ آپ ﷺ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ حتی کہ آپ نے ظہر، عصر، مغرب، عشا اور فجر کی نماز ادا فرمائی۔ صحابہ کرام یہودی کو گھورتے اور دھمکیاں دیتے تھے۔ نبی پاک ﷺ صحابہ کا یہ فعل سمجھ گئے۔ صحابہ کرام کہنے لگے: یا رسول اللہ ﷺ! آپ کو ایک یہودی نے روک رکھا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے منع فرمایا ہے کہ میں کسی ذمی یا غیر ذمی پر ظلم کروں۔ جب دن نکل آیا تو یہودی عالم نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ کو کہا کہ میری آدھی دولت صدقہ کے لیے حاضر ہے جہاں چاہیں خرچ کریں۔ وہ امیر آدمی تھا۔ اور کہا کہ بخدا میں نے یہ صرف اس لیے کیا کہ وہ علامتیں پہچان سکوں جو نبی آخر الزماں کی ہماری کتاب تورات میں لکھی ہوئی ہیں۔ وہ یہ کہ محمد ﷺ عبداللہ کا بیٹا ہوگا۔ اس کی جائے پیدائش مکہ اور ہجرت کا شہر طیبہ (مدینہ) ہوگا۔ اس کا ملک شام ہوگا۔ (اسے فتح کرے گا) بدزبان اور فحش گو نہیں

ہوگا۔ سخت دل اور بازاروں میں چلّانے والا نہیں ہوگا۔ نہ ہی فحش کی وضع اختیار کرنے والا اور نہ ہی بیہودہ بات کہنے والا ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

قارئین کرام! آپ نے یہودی علماء اور ان کے لیڈروں کی شہادتیں نبی اکرم ﷺ کی صداقت کے بارے میں ملاحظہ کیں مگر تاریخ شاہد ہے کہ پھر بھی اکثر یہودی ایمان نہ لائے، حق کو چھپانے والی بات ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ جیسے اللہ پاک فرماتے ہیں: ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ ''اے اہل کتاب تم حق کو باطل کا لباس کیوں پہناتے ہو (حق اور باطل کو خلط ملط کیوں کرتے ہو) اور علم رکھتے ہوئے بھی حق کو چھپا جاتے ہو۔''

(آل عمرٰن 71:3)

لہٰذا حق بات کو جان لینے کے بعد اسے تسلیم نہ کرنا اور چھپا جانا یہود کی بدعادت ہے جس سے ہم سب کو بچنا چاہیے۔ وگرنہ اللہ کا قانون جو اہل کتاب کے لیے حرکت میں آیا وہ ہمارے لیے بھی حرکت میں آسکتا ہے۔ یعنی ''جب انھوں نے ٹیڑھا پن اختیار کیا تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کردیا۔ اور ایسے فاسقوں کو اللہ ہدایت نہیں دیتا۔'' (الصف 5:61)

اللہ تعالیٰ ہمیں حق کو پہچان کر اسے قبول کرنے اور پھر اس کا اظہار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کیونکہ آج بھی آپ کو ہزاروں مسلمان ایسے مل جائیں گے جو نبی اکرم ﷺ کی صحیح حدیث کو جان کر بھی اس پر عمل نہیں کرتے گویا ذہنی و عملی طور پر حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ وما علینا الا البلاغ۔

طالب علم اور موبائل فون

کا منفی استعمال



عبدالوارث ساجد

''مس! باتھ روم میں ایک لڑکی موبائل پر بات کر رہی ہے۔'' میرے کالج میں موبائل فون لانے پر پابندی ہے، لہٰذا جیسے ہی چند طالبات نے مجھے یہ اطلاع دی، میں بڑی سرعت سے جائے وقوعہ پر پہنچی۔ ایک سیدھی سادی سی بچی تولیے سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی باتھ روم سے باہر نکلی۔

''موبائل نکالیے۔'' مجھے اس پر شک نہیں تھا، وہ تو اسے باتھ روم سے باہر آتے ہوئے دیکھ کر ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ ''میرے پاس نہیں..... مس! میرے پاس نہیں ہے موبائل۔'' بچی کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ اس کے معصوم چہرے سے نگاہ ہٹی اور براہ راست کالج مونوگرام والی جیب پر پڑ گئی۔

''یہ کیا ہے؟'' اگلے ہی لمحے چپس کا پیکٹ میرے ہاتھ میں تھا، جس کے اندر حرکت ہو رہی تھی۔

''میں نے استعمال نہیں کیا۔'' اس نے میرے ہاتھ سے چپس کے پیکٹ میں لپٹا ہوا موبائل فون جھپٹنا چاہا۔

''اول تو کالج میں موبائل فون لانے کی اجازت نہیں، پھر.....'' میری بات مکمل ہونے سے قبل اس نے کہا: ''مس! کیا بیگ میں رکھتی چوری نہ ہو جاتا۔''

''کل پرنسپل سے لے لینا، آج تو وہ میٹنگ میں گئی ہوئی ہیں۔''

میں نے اتنا کہا اور اگلا قدم بڑھانا چاہا جو اس نے بڑھنے نہیں دیا۔

''پلیز..... میرا موبائل دے دیجیے۔'' وہ برے طریقے سے جھپٹی۔

''میں نے کہا ناں، کل والدین کو بھیج دینا، مل جائے گا۔'' اس وقت موبائل فون پر کال آرہی تھی۔

''نہیں مجھے ابھی چاہیے، اسی وقت۔'' اس کا انداز نہایت جارحانہ ہو گیا تھا۔ مجھ پر حملہ کرنے کی لمحے بھر کی دیر تھی کہ سینیئر پروفیسر نے آ کر اسے ڈانٹا۔



یہ واقعہ کالج کی ایک لیکچرار کے ساتھ پیش آیا۔ اس واقعہ سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ نوجوان نسل بالخصوص طالبات میں موبائل فون کا منفی استعمال کس قدر بڑھ گیا ہے اور وہ کس انداز میں کن کن جگہوں پر اسے استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔

موبائل اور نوجوان نسل

موبائل فون کے بڑھتے ہوئے استعمال بالخصوص طلبہ و طالبات میں اس کے رجحان کی سب سے بڑی وجہ موبائل کمپنیوں کے انتہائی سستے اور کم ریٹ پیکج ہیں۔ موبائل کمپنیوں کے ''لیٹ نائٹ آورز'' طالب علموں کے لیے سب سے خطرناک اور نقصان دہ ہیں۔ اسی وجہ سے طلباء کی دلچسپی موبائل کی طرف بڑھ رہی ہے اور وہ اسے محض تفریح کے لیے استعمال کرنے لگے ہیں۔ رات کو مطالعہ کا شغف اسی لیٹ نائٹ آورز کی وجہ سے ختم ہوتا جا رہا ہے۔ دوستوں سے گپ شپ، ان جانے نمبروں پر کال اور بے معنی پیغامات سے طلبہ اپنا وقت برباد کرتے چلے جاتے ہیں۔ افسوس کہ اس وقت پاکستان میں فون استعمال کرنے والوں میں زیادہ تر طالب علم ہیں۔ ایک سروے کے مطابق پاکستان میں موبائل فون استعمال کرنے والوں کی بڑی تعداد طلبہ کی ہے۔ SMS کے ذریعے بات چیت بھی اسی طبقے میں زیادہ ہے۔ سروے کے مطابق 25 سال سے کم عمر لوگ زیادہ ایس ایم ایس کرتے ہیں جن میں کالج کے سٹوڈنٹ سب سے زیادہ ہیں جبکہ لیٹ نائٹ آفرز میں کال کرنے والوں میں بھی زیادہ تعداد انھی صارفین کی ہے جو 20 سال کی عمر کے درمیان ہیں۔ آپ کسی بھی تعلیمی ادارے کا معائنہ کر لیں، راہ چلتے کسی بھی طلبہ گروپ کو دیکھ لیں، آپ کو ان کے ہاتھوں میں کتابیں کم اور موبائل زیادہ نظر آئیں گے۔ نہ معلوم یہ ''ترقی'' ہے یا زوال۔ طلبہ تیزی سے کتابوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور موبائل کے رسیا بنتے جا رہے ہیں۔ جو وقت پہلے کتاب پڑھنے میں صرف ہوتا تھا، اب وہ موبائل پہ وقف ہونے لگا ہے چونکہ یہ کاروباری طبقہ نہیں اور رابطے بھی محدود ہوتے ہیں اس لیے موبائل فون کی دستیابی، فراغت اور سہولت انھیں غلط راہ دکھا دیتی ہے۔

گزشتہ سال لاہور کے تعلیمی اداروں میں ایسے ہی ایس ایم ایس کے غلط استعمال سے حکومت پنجاب کو حرکت میں آنا پڑا تھا۔

کالج میں موبائل فون پر پابندی

محکمہ تعلیم نے صوبہ پنجاب کے گرلز کالج میں موبائل فون پر پابندی عائد کر دی اور صوبائی حکومت کے اس اقدام پر طالبات کی طرف سے سخت ردعمل بھی آیا۔ کچھ طالبات نے احتجاج کے ساتھ ساتھ سخت الفاظ میں اس پابندی کی مذمت بھی کی لیکن یہ پابندی برقرار رہی۔ تاہم جیسے جیسے طالبات کی طرف سے احتجاج کی آواز بلند ہوتی گئی ویسے ویسے پابندی کی وجوہات بھی سامنے آتی چلی گئیں اور جب حقائق سامنے آئے تو وہ کچھ یوں تھے کہ لاہور کے ایک کالج کی طالبہ کا غیر اخلاقی ایس ایم ایس پر مبنی پیغام سیٹ ٹو سیٹ پھیلتا پورے لاہور میں گھوم گیا تھا۔ کالجوں میں زیر تعلیم طالبات کے والدین کے لیے یہ بہت بڑا المیہ تھا۔ ساتھ ہی شہر کے سنجیدہ حلقوں میں بھی آواز احتجاج بلند ہوئی تو صوبائی حکومت کو کالج میں طالبات کو موبائل فون لانے پر پابندی عائد کرنا پڑی۔

عالمی سروے رپورٹس ظاہر کرتی ہیں کہ سیل فون کے سب سے زیادہ صارف نوجوان نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں سے بیشتر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہیں۔ اس لیے پنجاب بھر کے کالجوں میں طالبات کے سیل فونز پر استعمال کو خاصا مضحکہ خیز کہا گیا۔ لڑکیوں کے موبائل اور اس کے غلط استعمال کا مسئلہ نیا نہیں۔ متعدد مغربی ممالک میں یہ مسئلہ آج سے کچھ برس پہلے ہو چکا ہے اور پورنوگرافی اور اس طرح کے دیگر مسائل نے ٹیکنالوجی عام ہونے کے بعد شدت اختیار کر لی ہے۔ اب یہاں ایسے قوانین پر کام ہو رہا ہے جن کی مدد سے ایسے مسائل پر قابو پایا جا سکے۔ بھارت میں ڈیڑھ سال قبل موبائل فون کے ذریعے سے غیر اخلاقی تصاویر کی ترسیل کا مسئلہ بہت زیادہ شدت سے ابھرا تھا جس میں ایک طالبہ کو بدنام کرنے کے لیے تصاویر جاری کی گئی تھیں۔ یہ معاملہ بھارتی سپریم کورٹ تک پہنچ گیا تھا۔ ایسے ہی کئی واقعات دیگر ممالک سے بھی منظر عام پر آئے۔ موبائل فون کو کچھ افراد غیر مہذب سرگرمیوں جیسے اخلاق سوز ایس ایم ایس اور تصویری اور ویڈیو پر مبنی پیغامات کی ترسیل کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اس کے غیر اخلاقی اور اخلاقی استعمال کی حدیں مقرر کی



جائیں تا کہ کسی بھی شخص یا صارف کی ذاتیات میں کوئی مداخلت نہ کر سکے۔ کچھ ایسے ہی غیر اخلاقی اسباب تھے کہ حکومت پنجاب کو طالبات پر موبائل رکھنے کی پابندی عائد کرنا پڑی۔

چور راستے

لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی کی طالبہ عطیہ امیر نے کہا کہ یونیورسٹی کے اندر موبائل فونز لانے پر سختی سے پابندی ہے لیکن طالبات کالج کے اندر آتے ہوئے اپنی کالج وین کے ڈرائیور کو موبائل فون دے کر اندر آ جاتی ہیں۔ اس لیے اس پابندی سے کچھ طالبات کو کوئی فرق نہیں پڑا کیونکہ وہ کالج کے اوقات کے بعد کسی سے بھی رابطہ کر سکتی ہیں۔ تاہم ایسی طالبات جو موبائل فون کالج کے اندر کسی اہم وجہ سے استعمال کرنا چاہیں انھیں خاصی مشکلات آتی ہیں۔ ایسے بہت سے چوری چھپے اور موبائل کے غلط واقعات سے اساتذہ بھی آگاہ ہیں۔

میں آ رہی ہوں

یہ صرف کالج کی طالبات ہی کی بات نہیں ہے، بلکہ اس کا شکار تمام نوجوان نسل ہے۔ لڑکے، لڑکیاں سب ہی اس بلا کا شکار ہیں۔ آپ کوچنگ سنٹرز کا دورہ کریں، وہاں مزید کم عمر اسکول کے بچے ہیں۔ اندر بچیوں کی کلاس ختم، باہر لڑکے ایس ایم ایس پڑھ رہے ہیں۔ ''میں آ رہی ہوں۔'' دو گھنٹے کی کوچنگ کلاس اکثر چار گھنٹے پر محیط ہو جاتی ہے۔ مائیں بچیوں کی زبانی سن کر مطمئن ہو جاتی ہیں۔ بلاشبہ اکثر سچ بھی ہوتا ہے، مگر ماؤں کو از خود تصدیق کرنی چاہیے۔ بچیوں کو انتہائی قیمتی تحائف مل رہے ہیں۔ مائیں باآسانی بچیوں کے جھانسے میں آ جاتی ہیں۔ یہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتیں کہ یہ کون سی سہیلی ہے، اگر بچی انجان نام لیتی ہے تو اس کی تفتیش کیوں نہیں کی جاتی۔ مائیں کیوں نہیں سوچتیں کہ بیٹی کی نئی دوست جس کا جمعہ جمعہ آٹھ دن سے نام سن رہی ہیں، بھلا وہ کیوں اتنے قیمتی تحائف دے گئی۔ بچی کو کیوں اچانک ہی سجنے اور سنورنے کا شوق ہو گیا ہے۔ کیوں وہ گھر سے سنور کر نکلنے لگی ہے؟ ماؤں کو کوئی پرواہ ہی نہیں ہوتی۔ خود محلے کی تاک جھانک میں اس قدر مگن رہتی ہیں کہ عزت کے محل میں دراڑیں پڑتی جا رہی ہیں۔ انھیں احساس ہی نہیں ہوتا، البتہ محل گر جانے کے بعد واویلا مچاتی ہیں۔

ماؤں سے التجا

میری ماؤں سے التجا ہے خدارا اپنی بچیوں پر توجہ دیں۔ یہ نازک کلیاں ہیں، ان کی اچھی آبیاری کریں گی تو یہ آپ کے گلشن کی رونق بنیں گی۔ ورنہ مسلی، مرجھائی کلیاں گلشن کا حسن ماند کر دیتی ہیں۔ یاد رکھیں منفی چیز جتنی معاشرے میں عام ہو گی اتنی ہی خرابی زیادہ پھیلے گی۔ برے کام کا نتیجہ بھی بُرا ہوتا ہے۔ یہی حال موبائل فون کے غلط استعمال کا ہے۔ موبائل فون کا غلط استعمال ان کی زندگی کو بھی متاثر کرتا ہے اور پڑھائی کو بھی۔

ایس ایم ایس کے بڑھتے ہوئے رجحان نے جہاں لڑکوں کے چلن بدل دیے ہیں وہاں لڑکیوں کی زبان کے استعمال پر منفی اثرات بھی مرتب کیے ہیں۔ زبان کے منفی استعمال میں بیہودہ الفاظ کے استعمال کے علاوہ اسلوب کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔

چال بھی بدلی اور زبان بھی

نوجوان نسل بالخصوص لڑکیاں ایس ایم ایس اور موبائل ٹیکنالوجی کی اس قدر عادی ہو چکی ہیں کہ وہ لیکچر اور پڑھائی کے دوران بھی موبائل فون آن رکھتی ہیں اور ایس ایم ایس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ایس ایم ایس وغیرہ میں بات کے لیے کم سے کم الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں اور اس طرح تمام الفاظ کے سپیلنگ مختصر کر دیے جاتے ہیں۔ جب یہ عادت بن جائے تو پھر لکھائی پڑھائی میں بھی یہی عادت جاری رہتی ہے اور پرچہ حل کرتے ہوئے بھی جلدی میں یہی الفاظ لکھ دیے جاتے ہیں۔ ابلاغ کے ذرائع میں اضافہ کرنے میں ٹیلی کام ٹیکنالوجی نے اہم کردار ادا کیا ہے لیکن اس کے بڑھتے ہوئے استعمال نے ابلاغ کے بنیادی ذریعے، یعنی زبان کی ساخت بگاڑ دی ہے۔

انتہائی سستے ایس ایم ایس کے بڑھتے ہوئے رجحان کے باعث معاشرتی اقدار بگڑ رہی ہیں اور مشرقی خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا ہے۔

بچوں کے بگڑنے میں جہاں موبائل فون کا غیر ضروری اور بے جا استعمال ہوتا ہے، وہاں والدین کا بھی قصور ہوتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کرتے ہیں لیکن ان کی سرگرمیوں پر نظر نہیں رکھتے ہیں۔

نوجوان کسی بھی قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ طالب علموں میں بڑھتا ہوا موبائل فون کا منفی استعمال اور اس سے رونما ہوتے واقعات ہمیں آنے والی تباہی سے آگاہ کر رہے ہیں۔





لباس بھی گفتگو کرتا ہے

عربی ادب سے ماخوذ

عمران صارم (ریسرچ فیلو دارالسلام)

اس کا نام آمنہ ہے۔ وہ یونیورسٹی کی طالبہ ہے۔ وہ پہلے بھی میرے پاس آتی رہتی ہے۔ اور مجھ سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتی ہے۔ اس بار جب وہ میرے ہاں آئی تو کچھ الجھی ہوئی اور پریشان دکھائی دے رہی تھی، میں نے اس سے وجہ پوچھی تو کہنے لگی: مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آرہی۔ میں نے پوچھا: کس بات کی؟ بتاؤ، شاید میں تمھاری کچھ مدد کر سکوں۔ کہنے لگی: جب بھی میں بازار یا کسی مارکیٹ جانے کے لیے گھر سے نکلتی ہوں تو نوجوان مجھے گھورتے ہیں، جملے کستے ہیں اور مختلف حرکتوں اور باتوں کے ذریعے سے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں، حالانکہ میں ایک معزز اور پاکباز لڑکی ہوں۔ مجھ میں اللہ کا خوف بھی ہے۔ میرے والدین نے میری اچھی تربیت کی ہے۔ پھر بھی نہ جانے میرے ساتھ تقریباً ہر بار ہی ایسا کیوں ہوتا ہے۔

میں نے کہا: میں تمھیں ایک بات کہنا چاہتی ہوں مگر سوچ رہی ہوں کہ کہوں یا نہ کہوں۔ وہ کہنے لگی: سوچنا کیسا؟ جو کہنا چاہتی ہیں کہیں۔ میں نے کہا: دراصل اس بات کا تعلق تمھاری ذاتی زندگی اور شخصی آزادی سے ہے اور ہوسکتا ہے کہ میری بات تمھیں عجیب لگے۔ کہنے لگی: آپ جو کہنا چاہتی ہیں کھل کے کہیں۔ میں خود آپ کے پاس آئی ہوں اور آپ سے سوال کر رہی ہوں۔ میں نے کہا: اچھا ٹھیک ہے، پھر میری بات ذرا توجہ سے سننا۔

تم نے ابھی اپنے بارے میں جو کچھ کہا وہ بالکل صحیح ہے مگر ایک چیز ایسی ہے جس کی طرف تم نے توجہ نہیں دی۔ اس نے پوچھا: وہ کیا؟ میں نے کہا: ''تمھارا لباس۔'' یہ سن کر اسے بہت حیرت ہوئی۔ کہنے لگی: میرا لباس! بھلا اس بات کا میرے لباس سے کیا تعلق؟ بس یہ ہے کہ میرا لباس عمدہ اور خوبصورت ہوتا ہے۔ میں سکارف بھی پہنتی ہوں، میں نے کہا: تم صحیح کہہ رہی ہو۔ لیکن لڑکوں کی نظر اور لڑکیوں کی نظر میں فرق ہوتا ہے۔ کہنے لگی: کیا مطلب؟ اپنی بات ذرا کھول کر بیان کریں۔

میں نے کہا: تمھارا لباس تنگ، چست ہوتا اور زرق برق ہے۔ لڑکے جب کسی لڑکی کو اس طرح کے لباس میں دیکھتے ہیں جو تنگ اور چست ہو اور اس سے لڑکی کے جسم کے اعضا نمایاں ہوتے ہوں، تو وہ اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ اس پر طرح طرح کے فقرے کستے اور ڈائیلاگ بولتے ہیں کہ شاید اس طرح وہ اس لڑکی سے دوستی کرنے میں کامیاب ہوجائیں یا اس سے کوئی تعلق بنالیں۔ کہنے لگی: میرے ساتھ جو ایسا ہوتا ہے کیا اس کی وجہ بھی یہی ہے؟ میں نے کہا: اگر تمھیں میری بات کا ثبوت چاہیے تو تجربہ کر کے دیکھ لو، ایک بار تم اسی طرح کا لباس پہن کر بازار جاؤ اور دوسری بار کھلا لباس پہن کر جس میں سادگی ہو اور جسم کے اعضا نمایاں نہ ہوں اور دونوں بار اپنے ساتھ پیش آنے والی صورت حال نوٹ کرو۔ تمھیں خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ دوسری بار تمھیں اپنے لباس کی وجہ سے اتنی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا، جتنی پریشانی کا سامنا تنگ اور چست لباس کی صورت میں کرنا پڑا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لباس بھی گفتگو کرتا ہے اور نوجوان لڑکوں سے یہ کہتا ہے: ''آؤ، مجھ سے باتیں کرو۔'' اس نے بڑے تعجب سے کہا: بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں نے کہا: دیکھو، مردوں میں خواتین کی خوبصورتی کی طرف میلان ایک



فطری بات ہے۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں یہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ﴾ ''لوگوں کے لیے خواہشات کی محبت مزین کردی گئی ہے، یعنی عورتوں سے.....'' لیکن اس طبعی اور فطری میلان کا ایک طریقہ بھی بتا دیا گیا ہے، یعنی مرد اور عورت کا باہم ازدواجی رشتے سے منسلک ہوجانا۔ اس طبعی خواہش کی تکمیل کے لیے آتی جاتی لڑکیوں کو گھورنا، ان پر فقرے اچھالنا یا اسی طرح کے اور بھونڈے طریقے استعمال کرنا قطعاً درست نہیں۔

دیکھو! لباس کی ہیئت و کیفیت، اس کی ڈیزائننگ اور رنگ ڈھنگ مرد کے عورت کی طرف فطری میلان کو مزید بڑھا دیتی ہیں..... کچھ دیر توقف کے بعد میں نے پھر کہا: اچھا کبھی تم نے غور کیا کہ لباس باہم رابطے کا ایک ذریعہ ہے؟..... میں شاید ایسے اپنی بات نہ سمجھا پاؤں، لہٰذا میں تمھیں کچھ مثالیں دیتی ہوں۔ تم کسی شخص کو اس سے بات کیے بنا محض اس کی وردی سے پہچان سکتی ہو کہ یہ جہاز کا کیپٹن ہے، یہ ڈاکٹر ہے، یہ انجینئر ہے، یہ مکینک ہے اور یہ خاکروب وغیرہ ہے۔ ایسے ہی اگر تمھارے لیے کسی نوجوان کا رشتہ آئے تو تم محض اس کا لباس دیکھ کر اس کی شخصیت کے بارے میں بہت کچھ اندازہ لگا سکتی ہو، بالکل یہی صورت اس لڑکی کے ساتھ پیش آتی ہے جس پر لڑکے فقرے کستے ہیں اور اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ اس لڑکی کا لباس انھیں ایسا کرنے کو کہہ رہا ہوتا ہے۔ شیطان کا ہدف ہے کہ وہ نوجوان لڑکیوں کو بے لباسی کی طرف لائے۔ اس سلسلے میں اس کی ابتدائی چال یہ ہے کہ وہ تنگ لباس کو نہایت خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے تاکہ جذبات کو انگیخت ہو اور فتنہ پیدا ہو۔ اور یہی کچھ اس نے ہمارے ماں باپ آدم و حوا علیہما السلام کے ساتھ کیا تھا کہ انھیں بے لباس کر دیا تھا۔ یہ بے لباسی اور عریانیت شیطان کے بنیادی اہداف میں سے ہیں۔

میری یہ باتیں سن کر وہ کہنے لگی: آپ کی باتیں مجھے بہت عجیب لگ رہی ہیں۔ میں نے کہا: یہ عجیب نہیں ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جو لڑکی سمجھدار ہوتی ہے وہ خود کو شیطانی افکار کا شکار نہیں ہونے دیتی۔ وہ ایسا نہیں کرتی کہ وہ خود کو شہوات کے بازار میں لاکر پیش کردے۔ بلکہ وہ اپنی نفسانی وجسمانی خوبصورتی کی حفاظت کرتی ہے۔ وہ روحانی طور پر خود کو مکمل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان دو نوجوانوں میں کتنا فرق ہے جن میں سے ایک اخلاقی بلندیوں پر فائز ہو اور دوسرا اخلاقی گراوٹ اور پستیوں کا شکار ہو! تمھیں چاہیے کہ تمھارا شمار اخلاق و کردار کے اعتبار سے بلند لوگوں میں ہو۔

کہنے لگی: مگر میں برہنہ تو نہیں ہوتی۔ میں نے کہا: تمھیں اندازہ ہے کہ چست اور تنگ لباس عریانیت کی بہ نسبت نوجوانوں کو زیادہ برانگیختہ کرتا ہے۔ اس سے جسم کے خدوخال نمایاں ہوجاتے ہیں جس سے نوجوانوں میں مزید حصوں کو دیکھنے کے شیطانی خیالات جنم لینے لگتے ہیں۔ اس طرح لباس انھیں اکسانے کا باعث بنتا ہے اور باقی کسر حرکات اور جملے بازی پوری کر دیتے ہیں۔ میری یہ باتیں سن کر وہ کچھ سوچنے لگی۔ پھر جب وہ بولی تو کہا: آپ کی باتوں نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ میں اپنے لباس کا انداز بدل لوں۔

میں نے اپنی بات کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے اس سے کہا: اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ ایک چھوٹا بچہ تمھارے پاس آئے، اس کا لباس پھٹا پرانا ہو تو تم اس کے بارے میں کیا سوچو گی؟ کہنے لگی: یہی کہ یہ فقیر اور ضرورت مند ہے، میں نے کہا: ٹھیک ہے، پھر اس کے بعد کیا کرو گی؟ کہنے لگی: میں اسے کوئی صدقہ، خیرات وغیرہ دے دوں گی۔ میں نے کہا: دیکھا، تم صرف اس کے لباس سے اندازہ کر لو گی کہ یہ فقیر ہے اور اسے صدقہ وغیرہ دو گی، حالانکہ اس نے تم سے کچھ کہا نہیں، اپنی ضرورت اپنی زبان سے بیان نہیں کی مگر تمھیں پتا چل گیا، بالکل ایسے ہی جب نوجوان لڑکے لڑکیوں کو اس قسم کا لباس پہنے دیکھتے ہیں تو وہ طرح طرح کے جملے بازی کرتے ہیں۔ لہٰذا لباس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ان لڑکیوں کا احترام اپنی جگہ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کا لباس ان نوجوان لڑکوں کو یہ دعوت دے رہا ہوتا ہے کہ ''آؤ! ہمیں دیکھو۔'' جبکہ انھیں اس کا احساس ہی نہیں ہوتا، یہ سب لاشعوری طور پر ہو رہا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان لڑکیوں کے ساتھ ایسا رویہ اپناتے ہیں۔

میری اس تفصیلی وضاحت پر اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ اور بالآخر ہم دونوں کی گفتگو اس خلاصے پر ختم ہوئی کہ ''لباس بھی گفتگو کرتا ہے۔''

فتاویٰ البانیہ



مولف: علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ

اعداد: فضیلۃ الشیخ راشد حسن حفظہ اللہ

ناشر: مکتبۃ الصدیق السلفیہ، میر پور خاص سندھ (0333-2884686,0336-2901780)

350 صفحات کی یہ کتاب 25 ابواب اور اس کے ذیل میں کم و بیش 300 فتووں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب دراصل علامہ البانی رحمہ اللہ کی تین کتابوں: نظم الفرائد، سلسلہ صحیحہ اور سلسلہ ضعیفہ میں شامل فتووں کی ترتیب اور اردو ترجمہ ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ کا ذوقِ حدیث اور کامل نظر اہل علم سے مخفی نہیں، اس لحاظ سے ان کے فتووں کا منظر عام پر آنا علم حدیث کی بہترین خدمت ہے۔ کتاب کے شروع میں مولانا مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ کا مقدمہ بھی درج ہے۔

مثالی گھر



تالیف: فاروق رفیع

صفحات: 416

ناشر: ترجمان الحدیث پبلیکیشنز

ملنے کا پتہ: نعمانی کتب خانہ، اردو بازار لاہور

042-37321865

زیر تبصرہ کتاب میں قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں گھر اور گھریلو زندگی سے متعلقہ 300 سے زائد راہ نمائیاں موجود ہیں۔ گھر کی ملکہ چونکہ عورت ہوتی ہے اس لحاظ سے زیادہ تر راہ نمائیاں خواتین سے متعلقہ ہیں۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ اسلامی گھرانہ کیسے وجود میں آتا ہے؟ ہمسائے کیسے ہوں؟ آپ کا گھر کہاں ہو؟ گھروں میں تصاویر آویزاں کرنے کا حکم؟ خواتین کا اپنے خادموں اور ڈرائیوروں سے پردہ؟ مذکورہ اور اس قسم کے اہم اور دلچسپ موضوعات کتاب کی اہمیت بڑھاتے ہیں۔ اپنے موضوع پر ایک اچھی اور جامع کاوش ہے۔

اہل حدیث کا منہج اور احناف سے اختلاف کی حقیقت ونوعیت



ترتیب: حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

ناشر: ام القریٰ پبلیکیشنز، سیالکوٹ روڈ فتومنڈ گوجرانوالہ: 0321-6464422

صفحات: 288

زیر تبصرہ کتاب متعدد جاندار مقالات کا مجموعہ ہے، مقالہ نگار حضرات کا نام اور ان کے مقالوں کے موضوعات ہی اس کتاب کی اہمیت کو دو چند کرنے کے لیے کافی ہیں۔ کتاب کے شروع میں بطور مقدمہ مولانا حنیف ندوی رحمہ اللہ کا مقالہ بعنوان تعارف اہلحدیث درج ہے۔ اس کے بعد مفسر قرآن اور مرتب کتاب ہذا حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ کا مقالہ ہے جو انھوں نے حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ کی کتاب الاصلاح کے لیے بطور مقدمہ لکھا تھا۔ تیسرا مضمون ایک دیوبندی عالم دین کا ہے جو گزشتہ

کتابوں کے دیس میں

ایڈیٹر





37 سال سے لندن کے تبلیغی مرکز سے وابستہ ہیں اس کا عنوان ہے: ''شخصیت پرستی اور شخصیت کے دینی و اخلاقی مفاسد'' چوتھا مقالہ مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ کا ہے۔ اس کا عنوان تقلید سے متعلقہ ہے۔ پانچواں مقالہ شیخ الحدیث مولانا عبدالرحمٰن ضیاء صاحب کا ہے اور چھٹا مضمون علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کا ہے۔ یہ دراصل ان کے اپنے ایک دوست کے ساتھ ''ہم سلفی کیوں کہلوائیں'' کے عنوان سے ایک مکالمہ تھا، کتاب کے تمام عنوانات نہایت مدلل ہیں اوراصلاح کی غرض سے منصۂ شہود پر لائے گئے ہیں۔

تفہیم اصول الشاشی



تالیف: ابونعمان بشیر احمد حفظہ اللہ

ناشر: مکتبہ اسلامیہ، غزنی سٹریٹ،

اردو بازار لاہور: 042-37244973

اصول فقہ کے موضوع پر مدارس کے نصاب میں شامل کتاب ''اصول الشاشی'' کا سوالاً جواباً آسان اردو حل ہے۔ اپنے موضوع پر ایک طالب علم کی ضرورت کو خاصی حد تک پورا کرتی ہے۔ خاصے کی چیز یہ ہے کہ صاحب کتاب سے اختلاف کو دلائل کے ساتھ حواشی میں سلجھے انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اوراصول شاشی میں درج روایات کی تخریج و تحقیق بھی کی گئی ہے۔ طالبانِ علم کے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔

پیام سیرت عصر حاضر کے پس منظر میں



تالیف: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر: زمزم پبلشرز، شاہ زیب سنٹر نزد مقدس مسجد

اردو بازار کراچی: 021-32729089

306 صفحات کی یہ کتاب 4 ابواب اور 38 ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب حیدر آباد سے شائع ہونے والے رسالے ''منصف'' میں چھپنے والے مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب کے ابواب کچھ اس طرح ہیں: باب اول: مطالعہ سیرت کے مبادی۔ باب دوم: حیات طیبہ ایک نظر میں۔ باب سوم: سیرت نبوی۔ سبق آموز پہلو۔ باب چہارم: امت پر نبی ﷺ کے حقوق

مؤلف حجر اسود کی تنصیب کے نبوی فیصلے سے راہ نمائی لے کر ایک جگہ لکھتے ہیں: ''اگر سماج میں کبھی باہم اختلاف پیدا ہوجائے تو کس طرح خوش تدبیری اور ذہانت کے ساتھ اس مسئلہ کو حل کرنا چاہیے اور ایسا رویہ اختیار کرنا چاہیے جس میں مختلف طبقات کی دل داری و دل جوئی ہو اور خود ہمیں امانت وسچائی کے اس معیار پر ہونا چاہیے کہ لوگ ہماری دیانت اور راست گوئی میں کوئی شبہ نہ کریں۔

آفتاب نبوت کی سنہری شعاعیں



تالیف: مولانا عبدالمالک مجاہد

ناشر: دارالسلام 36 لوئر مال، لاہور

042-37240024

نبی کریم ﷺ کی سیرت مبارکہ کے درخشاں پہلوؤں پر مشتمل یہ کتاب عام فہم زبان، بہترین انتخاب، محبت بھرے الفاظ، دلچسپ واقعات، خوبصورت ڈیزائننگ، بہترین کاغذ اور عمدہ طباعت کا حسین شاہکار ہے۔

سیرت کے ان واقعات کو عام کرنے کے جذبے سے مولف لکھتے ہیں: ''دنیا کے ہر شخص کو اسے شائع کرنے، فوٹو کاپی کرنے اور کسی بھی زبان میں اس کا ترجمہ کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ کسی بھی میگزین، رسالے اور اخبار میں بغیر کسی پیشگی اجازت کے اسے شائع کیا جاسکتا ہے۔ اگر مولف کا نام لکھنا چاہیں تو اجازت ہے نہ بھی لکھیں تو کوئی حرج نہیں۔''

اس کتاب کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ واقعاتی رنگ میں لکھی گئی ہے۔ جس سے سیرت کے پہلو بغیر کسی بوجھل پن کے سامنے آجاتے ہیں اور پڑھتے ہوئے آنکھوں دیکھا حال محسوس ہوتا ہے۔